غیر مقلدین

کے

متضاد فتوے

حنفی شافعی وغیرہ اختلاف کا طعنہ دینے والوں
اور فقہ کو اختلاف کا سبب کہنے والوں کی
اندرونی داستان

تالیف: حافظ عبد القدوس خان قارن
مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

المکتبۃ المدنیۃ
دیوبند — ۲۴۷۵۵۴ (یوپی)

حنفی شافعی وغیرہ اختلاف کا طعنہ دینے والوں
اور فقہ کو اختلاف کا سبب کہنے والوں کی

اندرونی داستان

غیر مقلّدین کے متضاد فتوے

تالیف

حافظ عبد القدوس خان قارن
مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

ناشر
المکتبۃ المدنیۃ
سفید مسجد دیوبند۔ فون: ۲۴۷۲۹

نام کتاب : غیر مقلدین کے متضاد فتوے

مصنف : حافظ عبدالقدوس خان قارن

مطبع : مدنی پرنٹرس اینڈ پبلشرز

کتابت : کریسنٹ کمپیوٹرس دیوبند

اشاعت اول : ۲۰۰۱ء

تعداد اشاعت : ۱۱۰۰

باہتمام : مدنی برادران

ناشر : مکتبہ مدنیہ فون: ۲۴۷۲۹

ملنے کے پتے

مکتبہ الحق، ماڈرن ڈیری جوگیشوری، ممبئی

مکتبہ مدنیہ، سفید مسجد دیوبند

فون: ۲۳۱۸۳، ۲۴۷۲۹_۰۱۳۳۶

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمده ونصلي على رسوله الكريم... اما بعد!

ہمارے مہربان غیر مقلد علماء کرام اپنی تقاریر اور اپنے حواریوں کے ذریعہ سے اختلافی مسائل کو ہوا دینے اور عوام الناس کے ذہنوں میں تشویش پیدا کرنے کا اپنا محبوب مشغلہ اپنے روایتی انداز میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ایک مسئلہ الجھاتے ہیں اور جب اس کا جواب دیا جاتا ہے اور محسوس کرتے ہیں کہ اس سے آگے ہمارے لئے دشواری ہے اور ہماری عافیت اسی میں ہے کہ مزید اس میں نہ الجھا جائے تو کوئی دوسرا مسئلہ کھڑا کر دیتے ہیں۔

احناف اور امام بخاریؒ کے درمیان بعض مسائل میں اختلاف

کچھ عرصہ قبل غیر مقلدین حضرات کی جانب سے بڑے زور وشور سے عوام الناس کو یہ باور کرایا جاتا رہا کہ احناف کو امام بخاریؒ سے اختلاف ہے حالانکہ بخاری شریف کو ساری امت اصح الكتب بعد كتاب الله (اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن کریم کے بعد باقی تمام کتابوں میں بخاری شریف سب سے زیادہ صحیح کتاب) مانتی ہے۔اور احناف اور امام بخاریؒ کے درمیان جو اختلافی مسائل ہیں ان میں سے بعض کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا اور اپنے علماء کے بخاری شریف کے اردو تراجم میں صفحات اور عبارات پر نشان لگائے ہوئے مقامات لوگوں کو دکھائے جاتے کہ دیکھو امام بخاریؒ نے کیا لکھا ہے اور احناف کا اس بارہ میں کیا نظریہ ہے۔اس صورت حال کے پیش نظر احناف علماء کرام کے پاس غیر مقلدین کے ستائے ہوئے لوگوں کے بہ کثرت سوالات آنے لگے اور اس بارہ میں مسائل دریافت کرنے والے وقتاً فوقتاً آتے رہے۔تو ہم نے علماء کرام اور عوام الناس کی سہولت کیلئے ایک رسالہ بنام بخاری شریف غیر مقلدین کی نظر میں شائع کیا جس میں چار درجن کے قریب ایسے مسائل با حوالہ بیان کئے جن میں غیر مقلدین کو امام بخاریؒ سے اختلاف ہے۔بفضلہ تعالیٰ

اس رسالہ کو علماء کرام اور عوام الناس نے سراہا اور معمولی عرصہ میں اس کے دو ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ اس کے بعد جب ان ہی حضرات سے جو احناف کو امام بخاریؒ کے ساتھ اختلاف کا طعنہ دیتے تھے اس بارہ میں بعض دوستوں نے پوچھا تو ان کا جواب وہی تھا جو عام طور پر پھنس جانے کی صورت میں دیا کرتے ہیں کہ ہم نے اس کا کلمہ تو نہیں پڑھا ہوا کہ اس سے اختلاف نہ ہو سکے۔

کیا امت میں اختلاف کا سبب فقہ ہے؟

اب کچھ عرصہ سے یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اور عوام الناس کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ امت میں اختلاف کا سبب فقہ ہے اگر ائمہ کرام کی فقہ کو نہ مانا جائے اور صرف کتاب اللہ اور صحیح احادیث پر عمل کیا جائے تو امت میں اختلاف باقی نہیں رہے گا۔ یہی بات غیر مقلد علماء کرام اپنی تقریروں اور تحریروں میں بیان کرتے چلے آ رہے ہیں کبھی ایک دین چار مذہب کے نام سے پمفلٹ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ جس میں اس بات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ کہ فلاں مسئلہ میں حنفی یہ کہتے ہیں شافعی یہ کہتے ہیں مالکی یہ کہتے ہیں۔ تو ان تمام باتوں کو دین کیسے کہا جا سکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اور کبھی رسائل میں یوں لکھا جاتا ہے۔ دراصل خرابی یہیں سے واقع ہوئی کہ لوگوں نے قرآن وحدیث کو سرچشمہ شریعت تصور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ائمہ کے اقوال کو بھی شریعت کا درجہ دے دیا۔ جس کی وجہ سے امت اختلافات کے بحر عمیق میں غرق ہو گئی۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص ۱۸۔ ۱۲ نومبر ۱۹۹۳ء)

اور کبھی اختلافات سے نکلنے کی یہ صورت پیش کی جاتی ہے "اب اس کا علاج یہی ہے کہ تقلید کی بندشوں سے آزاد ہو کر قرآن وحدیث کو سمجھیں اور ان پر عمل پیرا ہوں۔ (الاعتصام ص ۱۹۔ ۱۲ نومبر ۱۹۹۳ء)

ایسے بیانات سے سطحی قسم کے لوگ شش و پنج میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور امت میں وحدت کا عظیم الشان مقصد ذہن میں رکھنے کی وجہ سے اپنے علماء سے کرید کرید کر

پوچھتے ہیں کہ کیا واقعی امت میں اختلاف کا سبب فقہ ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو امت کو وحدت پر لانے کیلئے فقہ کی قربانی دے دینی چاہئے؟ مگر یہ محض دھوکہ ہے اور فقہ اسلامی کے خلاف زہر اگلنے، فقہ سے متنفر کرنے اور قرآن وحدیث کے مبارک عنوان سے لوگوں کو مغالطہ دے کر اپنے مسلکی نظریات پھیلانے کی مکروہ سازش ہے۔ اسلئے کہ اگر امت میں اختلاف کا سبب فقہ ہوتی تو فقہ کے تدوینی دور سے پہلے تو اختلاف نہ ہوتا۔ حالانکہ جزوی مسائل میں اختلافات تو حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے چلے آرہے ہیں۔ نیز ایسی صورت میں پھر قرآن وحدیث پر عمل پیرا ہونے کے دعویداروں میں تو اختلاف نہ ہوتا حالانکہ آپ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے کہ یہ طبقہ نماز اور طہارت جیسے اہم مسائل میں بھی اپنے اتحاد کا ثبوت نہیں دے سکا۔ جس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اختلاف کا سبب فقہ نہیں بلکہ اس کی وجوہات کچھ اور ہیں۔ اور جس طرح پرویزی وغیرہ منکرین حدیث احادیث کو اختلاف کا سبب قرار دے کر دین اسلام کو مٹانے پر کمربستہ ہیں اسی طرح غیر مقلدین حضرات بھی فقہ اسلامی کو اختلاف کا سبب قرار دیکر اپنے گمراہ کن نظریات کا پرچار کر رہے ہیں۔ حالانکہ جس طرح قرآن کریم کے ساتھ احادیث کو ماننا ضروری ہے اسی طرح قرآن وحدیث کے ساتھ فقہ اسلامی کو ماننا بھی ضروری ہے۔

جزوی مسائل میں اختلاف کا سبب

یہ بات کسی اور سے معلوم کرنے کی بجائے خود غیر مقلد عالم سے ہی پوچھ لینی چاہئے کہ اختلاف کا سبب کیا ہے؟ چنانچہ سردار اہلحدیث حضرت مولینا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں اختلاف صحابہ کرامؓ کے ملکوں میں انتشار ہونے سے پیدا ہوا ہے۔ حنفی طریقہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت پر مبنی ہے جس میں رفع یدین وغیرہ کا ذکر نہیں۔ (فتاوی ثنائیہ ص ۶۳۳، ج ۱ دفتاوی علمائے حدیث ص ۲۷۵، ج ۴)

قارئین کرام اس عبارت کو غور سے پڑھیں کہ سردار اہلحدیث کیا فرمار ہے

ہیں۔ ان کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ اختلاف کا سبب حضرات صحابہ کرامؓ سے مروی مختلف روایات ہیں اور نماز کا حنفی طریقہ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کے مطابق ہے۔ یعنی اختلاف پہلے سے تھا اور ان اختلافی صورتوں میں سے ایک کو احناف نے اختیار کیا ہے۔ تو اختلاف کا سبب ائمہ کرام کے اقوال اور ان کی فقہ تو نہ ہوئی۔ اسلئے کہ اختلاف تو پہلے سے موجود تھا۔

ائمہ مجتہدین کے اختلافات

حضرات صحابہ کرامؓ سے جزوی مسائل میں اختلافات کی روایات موجود ہیں جن کی حضرات محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ بالخصوص امام ترمذیؒ جیسے حضرات نے نشاندہی فرمائی ہے۔ اس اختلاف کو امت کیلئے رحمت کہا جاتا ہے۔ اسی لئے علماء امت نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرامؓ سے مروی اختلافی روایات میں سے تحقیق کے بعد جس کو راجح سمجھے یا محققین کی تحقیق پر اعتماد کر کے جس روایت کے مطابق کوئی مسلمان عمل کریگا وہ اس کیلئے نجات کا ذریعہ ہوگا۔ اور اس اختلاف کیوجہ سے امت کیلئے کافی آسانی اور سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ اب صحابہ کرامؓ کے بعد ائمہ مجتہدین کے اختلافات کی حیثیت کیا ہے؟ اس بارہ میں غیر مقلد عالم مولانا محمد عبداللہ صاحب روپڑیؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں۔ ائمہ اربعہؒ کا اختلاف قریب قریب صحابہؓ کے اختلاف کے ہے۔ مگر امام ابوحنیفہؒ نے ذرا قیاس کو زیادہ دخل دیا ہے (کاش ایسا نہ کرتے) اس لئے اہل الرائے کہلائے۔ (فتاوی اہلحدیث ص ۴۴، ج ۱)

قارئین کرام غور فرمائیں کہ ائمہ اربعہ کے درمیان اختلافات کو قریب قریب صحابہ کے اختلاف کے کہا گیا ہے تو جس طرح صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف پر طعن نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ائمہ اربعہ کے درمیان اختلافات پر بھی طعن نہیں کرنا چاہئے۔

امام ابوحنیفہؒ اور قیاس

بعض متشدد اور غالی غیر مقلدین حضرات عوام الناس میں یہ پروپیگنڈہ

کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے قرآن وحدیث کے خلاف اجتہاد اور قیاس کیا ہے۔ حالانکہ اسکی تردید خود غیر مقلد علماء کر چکے ہیں۔ چنانچہ شیخ الکل فی الکل حضرت مولانا ابوالبرکات صاحب مرحوم شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ گوجرانوالہ سے سوال ہوا کیا امام ابوحنیفہؒ یا کسی اور مجتہد کو اس بنا پر لعنت اللہ کہنا جائز ہے کہ انہوں نے حدیث کے خلاف اجتہاد کیا ہے۔ وضاحت فرمائیں۔ تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں کسی امام نے بھی حدیث کے خلاف اجتہاد نہیں کیا۔ حدیث کے خلاف اجتہاد اور پھر امام؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جو حدیث کے خلاف اجتہاد کرے وہ امام نہیں ہوسکتا۔ نہ امام ابوحنیفہؒ نے حدیث کے خلاف اجتہاد کیا ہے اور نہ ہی کسی اور امام نے۔ جس وقت حدیث نہیں ملتی اس وقت مجتہد اجتہاد کرتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قیاس پر عمل کرنے سے ضعیف حدیث پر عمل کرنا بہتر ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۳۰۶)

اسی طرح مولانا محمد عبداللہ صاحب محدث روپڑی مرحوم نے لکھا ہے۔ اہلسنت کے کسی فرقے کا یہ مذہب نہیں ہے کہ روایت اور درایت (یعنی قیاس) کا درجہ مساوی ہے بلکہ حنفیہ تو ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ پھر آگے مثالیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں غرض ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں حنفیہ نے ضعیف حدیث کی وجہ سے قیاس ترک کر دیا ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۴۲، ج ۱)

نیز ایک مقام میں فرماتے ہیں احناف دیوبندی اہل سنت میں شامل ہیں۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۶، ج ۱) اور ایک مقام میں حضرات صوفیاء کرام حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت علی ہمدانیؒ، حضرت نظام الدینؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان بزرگوں کے حالات جو صحیح طور پر ہمیں پہنچے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مسلک کے مطابق متبع سنت تھے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۱۵۱، ج ۱)

ان عبارات سے اس بات کی وضاحت ہوگئی کہ امام ابوحنیفہؒ نے نہ تو حدیث کے خلاف اجتہاد کیا ہے اور نہ ہی حدیث کے مقابل قیاس کو ترجیح دی ہے۔ ہاں جہاں

قیاس کی ضرورت تھی وہاں قیاس کیا ہے۔اور اس بارہ میں ان کی محنت دیگر ائمہ کی بہ نسبت زیادہ نمایاں ہے۔مگر ہے قواعد وضوابط کے مطابق۔اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ائمہ مجتہدین اور ان کے مقلدین کا عمل بھی اپنے اپنے مسلک کے مطابق سنت کے موافق ہے۔لہذا غالی غیر مقلدین کو اپنے سوا باقی لوگوں کی نمازوں کو خلاف سنت کہتے ہوئے شرم کرنی چاہیے۔

گستاخانہ انداز میں امام ابو حنیفہؒ کا نام لینا

گلی محلوں اور دیہاتوں کی غیر مقلدین کی مساجد کے بعض ائمہ جو آدھی نحو میر پڑھ کر اور آدھی سے گھبرا کر بخاری شریف کی کلاس میں جا بیٹھتے ہیں اور پھر اجتہاد کے اس منصب پر فائز ہو جاتے ہیں کہ ان کی نظر میں ائمہ مجتہدین بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ان کا اختلافی مسائل کو بیان کرنے کا انداز اور بالخصوص امام ابو حنیفہؒ کا نام وہ جس انداز سے لیتے ہیں اس انداز کو دیکھ کر کوئی شریف الطبع آدمی ان سے گفتگو کو بھی پسند نہیں کرتا۔اور وہ اپنے اس انداز میں اپنی جہالت کو چھپائے ہوتے ہیں۔مگر ظاہر یہ کرتے ہیں کہ فلاں بھی ہم سے گفتگو نہیں کرتا فلاں بھی ہم سے مباحثہ سے کنی کتراتا ہے۔گویا وہ اپنے اس انداز کو اپنی علمی قابلیت ظاہر کر کے اپنے سادہ لوح حواریوں کو نہ صرف خوش رکھتے ہیں بلکہ یہی انداز اپنے حواریوں کو سکھاتے ہیں اور چار نکات سکھا کر ان کی تربیت کرتے ہیں۔

۱۔ کسی کی نہ سنو بس اپنی سناؤ۔

۲۔ ہر بات پر صحیح حدیث کا تقاضہ کرو۔

۳۔ جب خود پھنس جاؤ تو کہو منع کہاں ہے منع کی حدیث بتاؤ۔

۴۔ انداز ایسا اختیار کرو کہ مقابلہ میں کوئی شریف آدمی بات ہی نہ کر سکے۔

حالانکہ ان کے بزرگوں نے قطعاً ایسا انداز اختیار کرنے کو پسند نہیں کیا۔ چنانچہ فتاویٰ ثنائیہ میں عقائد صحیحہ کے عنوان کے تحت جن عقائد کا ذکر کیا گیا ہے ان میں یہ بھی لکھا ہے۔اماموں اور مجتہدوں اور محدثین کی توہین کرنا،انہیں برا بھلا کہنا،ان

سے بغض رکھنا، دشمنی رکھنا، مسلمان کا کام نہیں۔ خصوصاً چاروں امام۔ امام ابو حنیفہ
امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ کی توہین کرنا، ان بزرگان دین کو برائی سے یاد
کرنا، ان سے دشمنی رکھنا صریح بے دینی ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۸۸، ج ۱)

چار نکاتی تربیت یافتہ

غیر مقلدین حضرات کے یہ چار نکاتی تربیت یافتہ جان بوجھ کر خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ کرتے اور علماء کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اسلئے علماء کو ان سے قطعاً بحث نہیں کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ خود تو علم سے کورے ہوتے ہیں صرف بحث میں اُلجھانے کا فن جانتے ہیں اور علم کی بات نہ ان کی سمجھ میں آتی ہے اور نہ ہی علم کی بات سمجھنے کی یہ کوشش کرتے ہیں۔ اسلئے ان سے الجھنے کی بجائے قرآنی حکم واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاماً پر عمل ہی کیا جائے۔ اور یہ صرف ٹکا سے جواب ہی سے خاموش ہوتے ہیں۔ علم کی بات ان کے پلے نہیں پڑتی۔ ایک دفعہ ہم ایک جنازہ کے انتظار میں ایک گلی میں کھڑے تھے۔ کہ پاس کھڑی ایک بھینس نے اتفاق سے پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ وہاں کھڑے لوگ چھلانگیں لگاتے ہوئے ادھر اُدھر ہونے لگے۔ تو ایک چار نکاتی تربیت یافتہ بول اٹھا کہ کوئی بات نہیں حلال جانور کا پیشاب ہے۔ اسکی بات ایک بوڑھے نے سن لی۔ تو وہ کہنے لگا کہ کوئی بات نہیں تو بیٹھ جا نیچے نہا لے۔ یہ سن کر وہ شرمندہ ہوا اور آس پاس کے لوگ ہنسنے لگے۔ ان چار نکاتی تربیت یافتہ کو اسی قسم کے جواب مناسب رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سمجھ نصیب فرمائے۔

احناف کی مساجد میں بعض تربیت یافتہ غیر مقلدین کا خواہ مخواہ جھگڑا کرنا

احناف کی مساجد میں تیس تیس سال سے بعض غیر مقلد حضرات نمازیں پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ وہ رفع یدین بھی کرتے ہیں۔ مناسب اونچی آمین بھی کہتے ہیں اور باقی اعمال بھی اپنے مسلک کے مطابق کرتے ہیں۔ اور شریفانہ انداز میں نماز پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔ کبھی کوئی شور شرابا نہیں ہوتا مگر جب کوئی چار نکاتی تربیت یافتہ کسی مسجد میں آجائے تو پھر ضرور شور سنائی دیتا ہے۔ اور وہ کبھی پاؤں ملانے کے معاملہ

ہیں، کبھی جماعت ثانیہ اور کبھی نمازوں کے اوقات کے متعلق جھگڑا کھڑا کر کے احناف کی مساجد کے ائمہ اور دیگر نمازی حضرات کو تنگ کرتا ہے۔ حالانکہ اس کی یہ کاروائی سراسر زیادتی اور ناانصافی پر مبنی ہوتی ہے۔ اسلئے ہم ان مسائل کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

پاؤں چوڑے کرنا

باجماعت نماز میں مقتدیوں کو صفیں درست رکھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہونے کا حکم ہے تاکہ درمیان میں دراڑیں نہ رہیں۔ جن میں شیطان گھس کر نمازی کی نماز کو خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ احادیث میں پاؤں، گھٹنے اور کندھے ملانے کا حکم ہے مگر ان چار نکاتی تربیت یافتہ حضرات کو صرف پاؤں ملانے کی فکر ہوتی ہے۔ اگر ساتھ والا آدمی پاؤں کو ذرا ہٹا لے تو یہ نماز کے بعد ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حالانکہ ان کی یہ کاروائی ان کے اپنے مسلک سے ناواقفیت کیوجہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے اپنے علماء نے یوں لکھا ہے اور بعض جاہل پاؤں خوب چوڑے کرتے رہتے ہیں اور کندھوں کا خیال ہی نہیں کرتے۔ کندھوں کے انداز سے پاؤں بالکل چوڑے نہ کرنے چاہئیں تاکہ پاؤں اور کندھے دونوں مل سکیں۔ اور اس سے پہلے لکھا ہے پس اس کو چاہئے کہ اپنا پاؤں اپنے کندھے کی سیدھ میں رکھے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۹۹۔۲۰۰، ج ۲ و فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۶۶، ج ۴، ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث لاہور ص ۶، ۲۸ مئی ۱۹۹۹ء)

لطیفہ

ایک مسجد میں ایک چار نکاتی تربیت یافتہ نماز کیلئے کھڑا ہوا تو ساتھ والے ایک بوڑھے آدمی کے پاؤں پر پاؤں چڑھاتا گیا وہ بوڑھا پاؤں ہٹاتا رہا اور یہ ملاتا جاتا۔ آخر اس بوڑھے نے کہا کہ تو یہ کیا کرتا ہے؟ تو وہ کہنے لگا کہ صف کو ملاتا ہوں اور پاؤں کو پاؤں کے ساتھ ملاتا ہوں۔ تاکہ درمیان میں شیطان نہ گھس جائے۔ تو وہ بوڑھا کہنے لگا کہ تو نے جس قدر ٹانگیں چوڑی کی ہوئی ہیں اس میں تو دس شیطان گھس

سکتے ہیں تو اس پر وہ شرمندہ ہوا۔

(احناف کے نزدیک نماز میں قیام کی حالت میں دونوں پاؤں کے درمیان چار انگلیوں جتنا فاصلہ ہونا چاہئے۔ (خیر الفتاوی ص ۲۶۹، ج ۲ و احسن الفتاوی ص ۳۱، ج ۳)

جماعت ثانیہ (دوبارہ جماعت)

غیر مقلدین کے چار نکاتی تربیت یافتہ جب جماعت ہو چکنے کے بعد مسجد میں آئیں گے خواہ وہ فٹبال، والی بال یا کرکٹ کھیل کر ہی دیر سے فارغ ہوئے ہوں۔ یا دوکان پر گاہکوں کی وجہ سے دیر ہوگئی ہو۔ تو وہ اصرار کریں گے کہ ہم دوبارہ جماعت کر کے ہی نماز ادا کریں گے۔ حالانکہ احناف کے ہاں مسافروں کے علاوہ کسی کو ایسی مسجد میں دوبارہ جماعت کرانا درست نہیں۔ جس کا امام اور نماز کے اوقات متعین ہوں۔ (شامی ص ۲۹۱، ج ۱۔ وفتاوی رشیدیہ ص ۲۹۰) اب اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ حضرات یا تو اپنی کسی مسجد میں چلے جائیں یا مسجد سے باہر جماعت کرالیں یا اپنے گھر تشریف لے جائیں وہاں جا کر جماعت کرالیں۔ جب یہ تمام متبادل صورتیں ان کیلئے موجود ہیں۔ تو اس کے باوجود ان کا احناف کی مساجد میں دوبارہ جماعت کرانے کا اصرار سوائے ہنگامہ آرائی کے اور کوئی مقصد نہیں رکھتا۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے بریلوی مکتب فکر کا کوئی آدمی کسی دیوبندی یا غیر مقلدین کی مسجد میں اذان سے پہلے یا بعد میں مروجہ صلوٰۃ وسلام کا یا میت کیلئے تیجہ وغیرہ کی رسم، قرآن خوانی کا اصرار کرے۔ جیسے اس کا یہ اقدام درست نہیں۔ اسی طرح احناف کی مساجد میں غیر مقلدین کا دوبارہ جماعت کا اصرار بھی درست نہیں اسلئے کہ جیسے دیوبندی اور غیر مقلدین حضرات کے نزدیک اذان سے پہلے اور بعد میں مروجہ صلوۃ وسلام اور تیجہ وغیرہ کی فاتحہ خوانی کی رسم درست نہیں۔ اسی طرح احناف کے نزدیک دوبارہ جماعت بھی درست نہیں ہے۔ تو یہ ان مساجد میں دوبارہ جماعت کا اصرار کیوں کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے اپنے علماء نے بھی دوبارہ جماعت کے بارہ میں جن خیالات کا اظہار فرمایا

ہے ان کی رو سے بھی ان حضرات کا اصرار صرف فساد کی نیت ہے اور کچھ نہیں۔ چنانچہ ان کے ہفت روزہ میں پوچھے گئے مسائل کے جوابات دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اسی میں ایک سوال کے جواب میں کہا گیا۔ اور دوسری جماعت کا اہتمام کثرت سے کرنا سلف صالحین سے ثابت نہیں۔ یہ محض ناگہانی ضرورت کی بنا پر ہے۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص ۶ ۔ ۲۵ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ)

اسی طرح ایک مضمون تعدد جماعت کی مضرتیں کے عنوان سے شائع ہوا اس میں بحث کا خلاصہ یوں پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت میں باہر سے آنیوالے مسافروں کی جماعت کیلئے گنجائش نکل سکتی ہے لیکن مطلقاً نہیں کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ نے ایک مسجد میں ایک نماز کی متعدد جماعتوں کو دستور العمل نہیں بنایا۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص ۲۰ ۔ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۶ھ)

نمازوں کے اوقات

صبح کی نماز اسفار (صبح کی روشنی) میں اور عصر کی نماز دو مثل کے بعد قدرے تاخیر سے پڑھنا احناف کے نزدیک مستحب ہے۔ جو کہ احادیث و آثار صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے اور احناف اپنی مساجد میں اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ لیکن جب غیر مقلدین کا چار نکاتی تربیت یافتہ کوئی آجاتا ہے۔ تو خواہ مخواہ اعتراضات شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ اس کو اس کا قطعاً حق نہیں ہوتا اسلئے کہ اگر اس کو اس وقت نماز پڑھنا پسند نہیں تو اپنی کسی مسجد میں جا کر نماز پڑھ لے اور اگر احناف کی مسجد میں ہی پڑھنا چاہتا ہے تو اسکو انتظامی معاملات میں مداخلت کا حق کسی طور پر نہیں۔ اور ایسا صرف شر و فساد برپا کرنے کی نیت سے ہی ہوتا ہے۔

سو شہیدوں کا ثواب

رافضیوں نے اپنے حواریوں کو یوں خوش کیا کہ محرم کی رسومات میں شرکت کرو اور ذوالجناح کی قربت حاصل کرو بس یہی تمہاری نجات کا ذریعہ ہے۔ اور اہل بدعت نے مزارات پر حاضری اور رسومات کی پابندی اور بہشتی دروازہ سے گذرنے

کے ذریعہ اپنے حواریوں کو تسلی دی کہ یہی کام تمہیں کامیابی سے ہمکنار کردیں گے۔اور غیر مقلدین نے بھی یہی طرز اختیار کیا اور سادہ لوح عوام کو یہ باور کرانا شروع کردیا کہ رفع یدین کرو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔جماعت ثانیہ اور چوتھے دن قربانی کر کے مردہ سنت کو زندہ کرو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔حالانکہ ان کا یہ طرز عمل بالکل باطل اور بے بنیاد ہے اور وہ مردہ سنت کو زندہ کر کے سو شہیدوں کے ثواب والی حدیث کو اسی طرح اپنے مسلکی نظریہ کی ترویج کیلئے ناجائز طور پر استعمال کرتے ہیں جس طرح خارجیوں نے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کے قرآنی حکم کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف استعمال کیا تھا۔اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مردہ سنت کو زندہ کرنے سے مراد کی وضاحت خود غیر مقلد عالم سے کردیں چنانچہ ایک سوال ہوا جس میں یہ بھی تھا کہ سجدہ کو جاتے ہوئے اور بین السجدتین رفع یدین کو مردہ سنت قرار دیا جاسکتا ہے؟ تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔مردہ سنت اسے کہتے ہیں جس کا کوئی عامل نہ ہو اور اس سنت پر عمل رہا ہو۔(فتاوی علمائے حدیث ص ۳۰۵، ج ۴)

مسئلہ رفع یدین

قارئین کرام اس وضاحت کی روشنی میں دیکھیں کہ رفع یدین کا مسئلہ جس میں احناف اور غیر مقلدین کے درمیان اختلاف ہے۔کیا اس پر مردہ سنت کا اطلاق ہوسکتا ہے؟ کیا جن حضرات کے نزدیک مختلف فیہ مقامات میں رفع یدین کرنا سنت اور راجح ہے وہ اس پر عمل نہیں کررہے؟ جب وہ عمل کررہے ہیں تو یہ مردہ سنت کیسے ہوگئی؟

باقی رہا یہ کہ احناف نہیں کرتے لہٰذا ان کے طبقہ میں یہ سنت مردہ ہوچکی ہے۔ان کو عمل کرانا سو شہیدوں کے ثواب پر ترغیب دینا ہے۔جیسا کہ مولانا محمد صادق سیالکوٹی صاحب مرحوم نے رفع یدین والی نماز کو مسواک کر کے پڑھی گئی نماز پر قیاس کرتے ہوئے لکھا کہ جس طرح مسواک کر کے پڑھی گئی نماز کا درجہ ستر گنا زیادہ ہوتا ہے۔اسی طرح رفع یدین کے ساتھ والی نماز کا درجہ بھی ستر گنا زیادہ ہوتا ہے۔(ملاحظہ ہو صلوۃ رسول ص ۲۲۷ ملخصاً) لیکن ہر صاحب علم جانتا ہے کہ یہ قیاس قطعاً

درست نہیں اسلئے کہ مسواک کی فضیلت والی روایات متفقہ ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح اور صریح بھی ہیں۔ جبکہ وہ صحیح روایات جن میں حضور علیہ السلام نے نماز کی تعلیم دی ان میں مختلف فیہ مقامات میں رفع یدین کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ اگر رفع یدین کی اتنی اہمیت ہوتی تو آپ ضرور تعلیم دیتے۔

احناف کے نزدیک نماز میں تکبیر تحریمہ، دعائے قنوت اور عیدین کی تکبیرات کے علاوہ باقی مقامات میں رفع یدین نہ کرنا اولیٰ ہے اور یہ طریق بھی سنت ہے۔ جس کا خود غیر مقلدین کو بھی اعتراف ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا۔ علمائے حقانی پر پوشیدہ نہیں ہے کہ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنے میں لڑنا جھگڑنا تعصب اور جہالت سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ مختلف اوقات میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا دونوں ثابت ہیں۔ اور دونوں طرح کے دلائل موجود ہیں۔ (فتاوٰی نذیریہ ص ۴۴۱، ج۱)

اور اسی بحث میں آگے لکھتے ہیں قصہ مختصر رفع یدین کا ثبوت اور عدم ثبوت دونوں مروی ہیں۔ (فتاوٰی نذیریہ ص ۴۴۴، ج۱) اس فتوی پر شیخ الکل فی الکل مولانا نذیر حسین صاحب دہلوی مرحوم کے علاوہ مولانا محمد عبدالقادر صاحب اور مولانا محمد اسماعیل صاحب کے دستخط بھی ہیں۔ اور یہی جواب فتاوٰی علمائے حدیث ص ۱۶۰، ۱۶۳، ج ۳) میں بھی دیا گیا ہے۔

جب احناف کے ہاں تحقیقی طور پر ان مختلف فیہ مقامات (رکوع جاتے وقت، رکوع سے اٹھتے وقت اور تیسری رکعت کے شروع) میں رفع یدین نہ کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔ تو پھر ان کو سو شہیدوں والی روایت کے ذریعہ سے رفع یدین کی ترغیب دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ اور جب رفع یدین نہ کرنا بھی ثابت ہے تو یہ بھی سنت ہے اور ایک سنت کو چھڑا کر اپنے مسلک کے مطابق دوسری سنت پر عمل کرنے کو مردہ سنت پر عمل کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس کو صرف مسلکی تعصب ہی قرار دیا جاسکتا ہے اور کچھ نہیں۔ جماعت ثانیہ کے بارہ میں خود غیر مقلد علماء سے نقل کردیا گیا ہے کہ اس

کی حیثیت کیا ہے اسلیئے اس پر بھی مردہ سنت کو زندہ کر کے سو شہیدوں کا ثواب حاصل کرنے کا اطلاق بالکل غلط ہے۔

چوتھے دن کی قربانی

غیر مقلدین کے بعض ائمہ مساجد اپنے حواریوں کو چوتھے دن کی قربانی کی اہمیت یوں بتاتے ہیں کہ یہ بھی مردہ سنت کو زندہ کر کے سو شہیدوں کا ثواب حاصل کرنے کا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض غالی جان بوجھ کر قربانی چوتھے دن تک مؤخر کردیتے ہیں۔ حالانکہ اسکی تردید خود ان کے اپنے علماء نے کی ہے۔ چنانچہ شیخ الکل فی الکل مولانا ابوالبرکات مرحوم سے سوال ہوا کہ ایک آدمی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے جان بوجھ کر قربانی چوتھے دن کرتا (حدیث) من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مائۃ شہید. تو کیا وہ اجرِ عظیم کا مستحق ہوگا یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ اس آدمی کا عمل نبیؑ کے عمل کے خلاف ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں پھر عید کے چوتھے دن بعد صرف جائز ہے سنت نہیں ہے۔ لہٰذا مردہ سنت کو زندہ کرنے والی بات ہی غلط ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ نے تیسرے اور چوتھے دن کبھی بھی قربانی نہیں کی۔ لہٰذا یہ آپ کی سنت نہیں اور مردہ سنت کو زندہ کرنے والی بات غلط ہے۔ اور جاہلوں والی بات ہے۔ جس کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۲۷۸)

فاتحہ خلف الامام

غیر مقلدین ہر جگہ یہ شور مچائے رکھتے ہیں کہ امام کے پیچھے اگر مقتدی سورۃ فاتحہ نہ پڑھے تو اسکی نماز ہی نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ ان کا مسلک نہیں بلکہ ان کی تحقیق ہے۔ اور ان حضرات کو اپنا مسلک بیان کرنے کا حق تو ہے مگر اپنی تحقیق کسی پر مسلط کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کی تحقیق کسی کیلئے حجت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ غیر مقلدین کے استاذ العلماء حضرت مولانا حافظ محمد صاحب محدث گوندلویؒ فرماتے ہیں۔ ہمارا تو یہ مسلک ہے۔ فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ فروعی اختلافی ہونے کی بنا

پر اجتہادی ہے۔ پس جو شخص حتی الامکان تحقیق کرے اور یہ سمجھے کہ فاتحہ فرض نہیں خواہ نماز جہری ہو یا سری۔ اپنی تحقیق پر عمل کرے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ اور ہماری تحقیق میں فاتحہ خلف الامام ہر نماز میں جہری ہو یا سری فرض ہے۔ اس کے چھوڑنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ (خیر الکلام ص ۳۳) اور محدث گوندلوی مرحوم کے اسی مسلک کی غیر مقلدین کے محقق عالم مولانا ارشاد الحق صاحب اثری نے توضیح الکلام ص ۴۵، ج ا میں تائید کی ہے۔

ہماری غیر مقلدین سے گذارش ہے کہ اپنا مسلک ضرور بیان کیا کریں مسلک کو چھپایا نہ کریں اور اپنی صرف تحقیق کے بیان پر ہی اکتفا نہ کیا کریں۔

جب امام ابو حنیفہؒ نے پوری دیانتداری کے ساتھ تحقیق کر کے یہ نظریہ واضح کیا کہ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھنی چاہئے۔ تو غیر مقلدین کے مسلک کے مطابق ان کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ اسی طرح جنہوں نے امام ابو حنیفہؒ کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے مطابق نظریہ اپنایا تو ان کی نماز بھی باطل نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود احناف کو تنگ کرنا کہ امام کے پیچھے فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی تو یہ سراسر زیادتی ہے۔ اگر غیر مقلدین دیانتداری سے اپنا یہی مسلک بیان کرتے رہیں تو پھر لڑائی جھگڑے تک نوبت ہی نہ آتی۔ مگر یہ حضرات اپنا مسلک چھپا کر اپنی تحقیق دوسروں پر مسلط کرنے کی جب کوشش کرتے ہیں تو پھر فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت اور سمجھ نصیب فرمائے۔ (آمین)

سبب تالیف

ہم نے پہلے اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ کچھ عرصہ سے بڑے منظم انداز میں یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ امت میں اختلاف کا سبب فقہ ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ نیز بہت سے مقامات سے اطلاعات ملی ہیں کہ غیر مقلدین حنفی شافعی وغیرہ اختلافات کا طعنہ دیکر بھی لوگوں کو پریشان کرتے ہیں۔ تو ہم نے ضروری سمجھا کہ عوام الناس کو بتلایا جائے کہ جزوی مسائل میں اختلافات تو خود

مقلدین حضرات کے آپس میں بھی ہیں تو پھر ایسی طعنہ بازی ان کو کسی طور پر بھی زیب نہیں دیتی۔

اختلافی مسائل کا حل ـــــ غیر مقلدین میں اختلافی صورت زیادہ پریشان کن ہے۔ اسلئے کہ اختلافی مسائل کے حل اور عمل کیلئے کسی ایک پہلو کو اختیار کرنے کیلئے مقلدین کے ہاں تو ضابطہ ہے کہ اگر حنفی شافعی وغیرہ مختلف مسالک کا اختلاف ہے۔ تو ہر مسلک والا اپنے امام اور اپنے مسلک کے محققین کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے عمل کریگا۔ اور اگر کسی مسلک کے اپنے علماء کے درمیان مسائل میں اختلاف ہو تو مفتیٰ بہا مسائل پر عمل کیا جائے گا۔ اور غیر مفتیٰ بہا کو ترک کر دیا جائیگا۔ اسلئے مقلدین کے ہاں تو ضابطہ ہے۔ مگر غیر مقلدین ان اختلافی مسائل میں کسی ایک پہلو کو اختیار کرنے کیلئے کونسی صورت اور ضابطہ سے کام لیتے ہیں؟ اسلئے کہ ان کے تمام علماء جنہوں نے مسائل بتائے ہیں۔ وہ سب کے سب صرف قرآن وحدیث سے مسائل لینے کے دعویدار ہیں اور ہر مسلمان یہ سوال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ کہ صرف قرآن و حدیث سے مسائل لینے والوں کے درمیان مسائل میں اختلاف کیوں ہے؟

کیا جن جن حضرات نے مسائل بتائے ہیں ان سب کے مسائل برحق ہیں؟

اگر ان میں سے بعض کے مسائل حق پر نہیں تو غیر مقلدین حضرات کے وہ علماء جو دوسروں کی کتابوں میں خواہ مخواہ کیڑے نکالنے پر کمربستہ ہیں کیا انہوں نے اپنے عوام کی سہولت کیلئے حق اور باطل مسائل کو جدا جدا کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے؟ اور کیا ناحق مسائل بتانے والوں کے خلاف اپنے قلمی اور تقریری جہاد کا رخ موڑا ہے؟ اگر نہیں تو کیا اسکو مسلکی تعصب کے علاوہ کوئی اور نام دیا جاسکتا ہے؟

ے کوئی تو ڈال دے ان پر جواب کی چادر مسک رہے ہیں برہنہ سوال چہرے پر

طریق کار

ہم نے بعض وجوہات کی بنا پر اپنے اس رسالہ میں زیادہ تر اردو فتاویٰ جات اور دیگر اردو زبان میں لکھی گئی غیر مقلدین کی کتابوں کو ہی منتخب کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ جو آدمی مسائل کا جواب دیتا ہے تو وہ اس مسئلہ میں پوری تحقیق کے بعد جواب دیتا

ہے۔اور پھر اس پر عمل کی ذمہ داری لیتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔جبکہ عام کتابوں میں بعض دفعہ آدمی بے تحقیق بات بھی لکھ دیتا ہے۔اسلئے ہم نے فتاویٰ جات کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے۔اس لئے کہ ان میں مسائل کی تحقیق کی ذمہ داری لی گئی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ معمولی تعلیم والا جس نے پرائمری تک اردو تعلیم حاصل کی ہو وہ بھی اگر حوالہ جات کو دیکھنا چاہے تو آسانی سے دیکھ سکے۔ان حوالوں کو دیکھنے اور سمجھنے کیلئے کسی کو کسی عالم دین کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ورنہ ان کی عربی اور دیگر زبانوں میں لکھی گئی کتابوں میں طہارت ونماز جیسے اہم مسائل میں اس سے بھی کہیں زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ غیر مقلدین کے آپس میں تمام اختلافی مسائل کا انحصار مقصود نہیں۔بلکہ فقہ اسلامی کے خلاف پروپیگنڈہ کو روکنے کیلئے بعض ضروری اور اہم مسائل میں ان کے اختلافات کو ظاہر کیا گیا ہے۔تاکہ عوام الناس کو معلوم ہو جائے کہ جزوی مسائل میں اختلافات صرف فقہ کو ماننے والوں میں نہیں بلکہ ان لوگوں کے بھی آپس میں اختلافات ہیں۔جو صرف قرآن وحدیث پر عمل پیرا ہونے کے دعویدار ہیں۔خیال تو یہ تھا کہ بات مختصر سے مختصر کی جائے مگر پھر بھی بات بڑھتی گئی اور زبردستی مزید طوالت سے قلم کو روکا گیا ہے۔اور ہم نے ان ہی حضرات کی معتبر کتابوں اور رسائل سے براہ راست بقید صفحات حوالے دیئے ہیں۔اسلئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے۔

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں　　زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں　　چراغ میرا ہے رات ان کی

احقر حافظ عبدالقدوس خان قارن

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔۔۔اما بعد!

اہل حق پر اعتراضات اور ان کے خلاف باطل پروپیگنڈہ شروع سے چلا آرہا ہے اسلئے میں اپنے دوست واحباب سے گذارش کروں گا کہ ایسی صورت حال پر گھبرایا نہ کریں۔ اگر وقتی طور پر پریشانی ہوتی ہے تو اللہ تعالےٰ اس پریشانی کو دور کرنے کے اسباب بھی مہیا فرما دیتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ اعتراضات اور پروپیگنڈہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اسلئے کہ جواب کی صورت میں حق کی صورت عوام الناس کے سامنے زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔

اہل دل شدت غم سے کہیں گھبراتے ہیں   اوس پڑتی ہے تو پھول اور نکھر جاتے ہیں

اب ہم فقہ کو اختلاف کا سبب کہنے والوں اور حنفی شافعی وغیرہ اختلافات کا طعنہ دینے والوں کی اندرونی داستان پیش کرتے ہیں تا کہ عوام الناس کو معلوم ہو جائے کہ قرآن وحدیث پر عمل پیرا ہونے کے دعویداروں کا آپس میں کس قدر اختلاف ہے۔

غیر اللہ کو پکارنا

غیر مقلد حضرات عام طور پر لوگوں کو یہی بتاتے ہیں کہ ہم پکے مؤحد ہیں۔ نہ ہم غیر اللہ کو پکارتے ہیں اور نہ ہی ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے غیر اللہ کو پکارنے کا شبہ ہوتا ہے۔ حالانکہ صوت حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ غیر مقلد عالم نواب وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں کہ دعاء شرعی تو عبادۃ ہے جیسا کہ نماز تو یہ غیر اللہ سے جائز نہیں۔ اور دعاء لغوی بمعنے نداء یعنی پکارنا تو یہ غیر اللہ کیلئے مطلقاً جائز ہے۔ خواہ جس کو پکارا جا رہا ہے وہ زندہ ہو یا مردہ ہو۔ اور آگے لکھتے ہیں **وقال السید فی بعض تو الیفہ قبلہ دین مددی کعبہ ایمان مددی ابن قیم مددی قاضی شوکان مددی** (ہدیۃ المھدی ص ۲۳) اور سید (نواب صدیق حسن خان) نے اپنی کسی کتاب میں کہا ہے اے قبلہ دین میری مدد کر۔ اے ایمان کے

کعبہ میری مدد کر۔ اے ابن قیم میری مدد کر۔ اے قاضی شوکانی میری مدد کر۔
یہ الفاظ کسی عام کے نہیں بلکہ غیر مقلدین کے عظیم ستون نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے ہیں جن کو غیر مقلد عالم نواب وحید الزمان اپنے دعویٰ کی دلیل کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ جب ان الفاظ کے بارہ میں سردار اہلحدیث مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم سے سوال ہوا کہ یہ الفاظ کہنے جائز ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔ مذہبی اصطلاح میں جائز نہیں شاعرانہ اصطلاح کے ہم ذمہ دار نہیں (فتاوی ثنائیہ ص ۱۴۷، ج ۱) یہ حال ہے غیر مقلدین کی توحید کا۔

وسیلے

بعض دفعہ دعاء کرنے والے حضرات بحرمۃ فلان۔ بحق فلان۔ فلان کی برکت سے اور فلاں کے وسیلہ جیسے الفاظ سے دعاء کرتے ہیں۔ کیا ان الفاظ کے ساتھ دعاء کرنا اور دعاء میں وسیلہ پکڑنا جائز ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے متضاد نظریات ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ جائز ہے اور کوئی کہتا ہے کہ ناجائز ہے۔

☆ پہلا نظریہ کہ ان الفاظ سے دعاء کرنا جائز ہے۔ چنانچہ نواب علامہ وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں کہ زندہ ہو یا مردہ ہر کسی کو وسیلہ بنانا جائز ہے۔ لانہ اذا ثبت جواز التوسل لغیر اللہ فای دلیل یخصہ بالاحیاء (ہدیۃ المھدی ص ۴۷) اسلئے کہ جب غیر اللہ کے ساتھ وسیلہ پکڑنا جائز ہے۔ تو پھر کونسی دلیل کے ساتھ اسکو صرف زندوں کو وسیلہ بنانے کے ساتھ مختص کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ اختلفوا فی الدعاء بحق فلان او حرمۃ فلان کما ھو المرسوم عند الصوفیۃ کلھم فقال البعض لا یجوز لانہ لیس علی اللہ حق لاحد والصحیح جوازہ (ہدیۃ المھدی ص ۴۹) تمام صوفیاء کے ہاں جو دعاء میں بحق فلاں یا بحرمۃ فلاں کے ساتھ دعاء کی جاتی ہے اسمیں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ اسلئے کہ اللہ پر کسی کا حق نہیں ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ایسا کہنا جائز ہے۔

اسی طرح غیر مقلدین کے شیخ الکل فی الکل مولانا نذیر حسین صاحب دہلوی مرحوم اپنے دستخط کرتے وقت یوں لکھتے ہیں ۔ العاجز محمد نذیر حسین عافاہ اللہ فی الدارین بجاہ سید الثقلین (معیار الحق ص ۴۱۹) اور دوسری جگہ لکھتے ہیں و ابقاہ مدی الزمان سالماعن مطاعن اھل البدعۃ و الطغیان بحرمۃ سید الثقلین جدالحسن و الحسین آمین آمین آمین (معیار الحق ص ۴۲۱)

یہ عبارات اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہیں کہ بحرمۃ یا بجاہ وغیرہ الفاظ کے ساتھ دعاء کرنا جائز اور درست ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ ان الفاظ کے ساتھ دعاء کرنا منع اور حرام ہے۔ چنانچہ استغاثہ بجاہ فلان کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے۔ اس قسم کے الفاظ جن میں سوال اور استغاثہ پایا جاتا ہے۔ ایسا کہنا نا جائز اور شرک میں داخل ہے۔ کیونکہ کوئی میت خواہ وہ نبی ہو یا ولی اس کو حاجت کے وقت پکارنا، اس سے دعا مانگنا یا اس سے فریاد کرنا جائز نہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۳۶، ج ۵) اسی طرح ایک سوال ہوا کہ دعاء میں یا جبرائیل وغیرہ کہنا یا بحق محمد وغیرہ کہہ کر دعاء کرنا اس کا کیا حکم ہے؟ تو جواب دیا گیا یہ وظیفہ بالکل جائز نہیں ہے۔ ایک تو اس میں یا جبرئیل وغیرہ شرک ہے دوم اسمیں بحق محمد وغیرہ ہے۔ جو حرام ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۴۱۵، ج ۳) اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں کہا گیا دعاء بحرمت منع ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۴۴، ج ۹)

اور ایک سوال کے جواب میں کہا گیا اس طرح دعاء کرنا بدعت ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۵۶، ج ۹)

محفل میلاد وغیرہ کی تردید

بظاہر غیر مقلدین بڑے زور و شور سے کہتے ہیں کہ ہم بدعات کے سخت مخالف اور ان سے بہت ہی متنفر ہیں مگر ان بدعات کی تردید میں بھی ان کے نظریات مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بدعت ہے اور کوئی کہتا ہے کہ ان مسائل میں تشدد نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆ پہلا نظریہ کہ محفل میلاد وغیرہ بدعت ہے۔ چنانچہ غیر مقلدین کے ہفت روزہ میں شیخ عبدالعزیز بن باز کے مضمون کا ترجمہ شائع ہوا۔ جس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ کام یعنی محفل میلاد کا انعقاد دین کا کام نہیں بلکہ نئی ایجاد کردہ بدعات میں سے ہے اور یہود ونصاری کی نقل ہے۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور س ۱۳۔ ۹ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ)

☆ دوسرا نظریہ کہ ایسے مسائل میں تشدد نہیں کرنا چاہیے چنانچہ نواب علامہ وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں وکذالک من یز جز الناس با لعنف والتشدد وعلی سماع الغناء او المزامیر او عقد مجلس المیلاد او قراءة الفاتحة المرسومة ویفسقهم او یکفرهم علی هذا (ہدیۃ المہدی ص ۱۱۸) اسی طرح وہ لوگ بھی اجر کی بجائے خود کو گناہ میں ڈالتے ہیں۔ جو گانے بجانے یا بانسریاں بجانے یا مجلس میلاد کے انعقاد یا مروجہ فاتحہ خوانی پر لوگوں سے تُرش روئی اور سختی سے پیش آتے ہیں۔ اور ان کو فاسق یا کافر کہتے ہیں۔

<u>باہمی اختلاف میں سخت کلامی</u>

آپس میں اختلاف تو ہو ہی جاتا ہے مگر علماء دین کو سخت کلامی سے گریز کرنا چاہیے آیئے اس بارہ میں غیر مقلدین علماء کے طرز عمل کا کچھ نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

ا۔ رکوع سے اٹھ کر ہاتھ باندھنے چاہئیں یا نہیں اسی بارہ میں پیر جھنڈا صاحب کے ساتھ مولانا عبداللہ روپڑی صاحب مرحوم وغیرہ کو اختلاف ہوا اس بارہ میں مسئلہ پوچھا گیا تو شیخ الکل فی الکل مولانا ابوالبرکات صاحب جواب دیتے ہیں۔ علامہ محمد عبداللہ صاحب محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایک غلطی کی نشاندہی کر کے فرمایا کہ یہاں بھی شاہ کو غلطی لگی ہے۔ یہاں بھی شاہ کو غلطی ہے اس طرح انہوں نے غلطیاں واضح کی ہیں۔ لیکن شاہ جی کے منہ سے کوئی بات نکل جائے تو وہ پتھر پر لکیر بن جاتی ہے۔ وہ کب ماننے والے ہیں۔ انہوں نے اپنے گرد چند بیوقوف اکٹھے کئے ہوئے ہیں، کچھ مقلد بن کر ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ دلیل اس کی کچھ بھی نہیں

ہے۔(فتاویٰ برکاتیہ ص ۳۶)

۲۔ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم نے قرآن پاک کی تفسیر لکھی جس پر علماء کو کچھ اعتراضات تھے جن میں مولانا محمد عبداللہ صاحب روپڑی مرحوم سرفہرست تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں مولوی ثناء اللہ صاحب کا دعویٰ ہے کہ میں اہلحدیث ہوں لیکن طرز عمل ان کا اہلحدیث کے خلاف ہے۔ تو پھر اہل حدیث ہونے کا دعویٰ ان کے منہ سے کس طرح زیبا ہوسکتا ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۷۵، ج ۱)

اور محدث روپڑی کے شاگرد مولانا محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں انہی اغلاط کی بنا پر محدث روپڑی" مولانا امرتسری کو راہ سلف سے برگشتہ تصور فرماتے تھے۔ (مقدمہ فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۹، ج ۱)

اس کے برخلاف مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی صاحب" لکھتے ہیں۔ میری نظر کے سامنے وہ اعتراضات بھی ہیں اور معترضین حضرات بھی۔ اس لئے میں علی وجہ البصیرت یہ کہنے کیلئے تیار ہوں کہ جو جو اعتراضات ان کی تفسیر پر بعض علماء نے کئے وہ اکثر غلو یا غلط فہمی یا حسد پر مبنی ہیں۔ (مقدمہ فتاویٰ ثنائیہ ص ۱۷، ج ۱)

احناف سے گذارش

ہم اپنے احناف بھائیوں سے گذارش کرتے ہیں کہ جو طبقہ اپنے ہی علماء کو یوں کہہ دے کہ اس نے اپنے گرد چند بے وقوف اکٹھے کئے ہوئے ہیں۔ یا وہ راہ سلف سے برگشتہ ہے۔ یا اس کا طرز عمل اہلحدیث کے خلاف ہے۔ یا وہ غلو اور حسد سے کام لیتا ہے۔ تو اس طبقہ کے فتووں سے نہ گھبرایا کریں۔ اس لئے کہ یہ ان بیچاروں کی عادت ہے۔

نیت میں فتور

۱۔ ہر مسلمان جو عمل کرتا ہے اسکی نیت خالص رضاء الٰہی کی ہونی چاہئے۔ مگر غیر مقلدین حضرات کی نیت ملاحظہ فرمائیں کہ ایک دینی مدرسہ کا قیام عمل میں لائے مگر نیت دین کی نشرو اشاعت نہیں بلکہ مدرسہ دیوبند کا مقابلہ کی نیت ہے۔ چنانچہ محدث

روپڑی مرحوم کے شاگرد مولانا محمد صدیق صاحب اپنے استاد محدث روپڑی مرحوم کی شان بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ابھی آپ کو روپڑ آئے ہوئے دو سال کا عرصہ ہی ہوا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے مقابلہ میں شیخ عطاء الرحمٰن اور اس کے دوسرے اعزہ نے دہلی میں دارالحدیث رحمانیہ کے نام سے ایک شاندار درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ اس کے نظم و نسق اور درس و تدریس کے لئے ہندوستان کے پورے علماء میں سے منتظمین کی دور رس نگاہ نے آپ کا انتخاب کیا۔ (مقدمہ فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۸، ج ۱)

۲۔ کسی سائل کو دینی مسئلہ بتانا انتہائی اجر و ثواب کی بات ہے۔ اور مسئلہ بتانے والوں کے مجموعہ فتاویٰ میں خلق خدا کی اصلاح اور ان کیلئے آسانی پیدا کرنے کے واسطہ سے رضاء الٰہی مقصود ہوتی ہے مگر اس نیک کام میں بھی غیر مقلدین کی نیت ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ فتاوی نذیریہ کی تمہید لکھنے والے صاحبان لکھتے ہیں کہ حضرت شمس العلماء مولوی سید محمد نذیر حسین صاحب المعروف میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو فتوے خود لکھے یا تلامذہ و فرزندان وغیرہم سے لکھوائے اور ان کو اپنی مہر و دستخط و اصلاح سے مزین فرمایا اگر یہ سب دستیاب ہوتے تو یقیناً فتاوی عالمگیری سے چہار چند یا اس سے بھی زائد ہو جاتے۔ (تمہید فتاوی نذیریہ ص ش، ج ۱)

یہ نیت نہیں کہ خلق خدا کو زیادہ فائدہ پہنچتا بلکہ نیت یہ ہے کہ فتاوی عالمگیری سے چہار چند ہو جاتے۔

۳۔ مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم اپنے آپ کو حنفی اہلحدیث کہلاتے تھے۔ تو اس بارہ میں مولانا محمد عبداللہ صاحب امرتسری مرحوم سے سوال ہوا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب دیا کہ مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم جس معنی سے حنفی اہلحدیث کہلائے اس معنی میں تقلید شخصی کی شرعی حیثیت کچھ نہیں رہتی۔ کیونکہ اہلحدیث کے ساتھ حنفیت کے اضافہ کا صرف یہ مطلب ہے کہ جو مسئلہ قرآن و حدیث سے نہ ملے اس میں اپنی رائے سے کسی امام کا قول لینا بہتر ہے۔ اور ہندوستان میں چونکہ حنفی مذہب زیادہ مروج ہے اس لئے انہی کی موافقت ان کو انسب معلوم ہوئی۔ اور پھر آگے لکھتے ہیں اگرچہ

ہم اس میں بھی مولینا محمد حسین مرحوم کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ رواج سے متاثر ہ
کی شان نہیں۔ (فتاوی اہلحدیث ص ۱۰۸۔۱۰۹، ج ۱)

جو مسائل قرآن و حدیث میں نہ ملیں ان میں بھی احناف کے مطابق ف
پسند نہیں کرتے۔ بلکہ جو ایسا کرتا ہے اس کو غلطی پر سمجھتے ہیں اسلئے کہ نیت صرف ی
کہ اپنے ہی مسلک کا پرچار ہو۔

بے نمازکا حکم

بے نماز کے بارہ میں احادیث میں سخت وعید آئی ہے۔ حتی کہ یہ بھی فرما
ہے کہ جان بوجھ کر جو نماز کو چھوڑے وہ کافر ہو گیا۔ اکثر علماء تو اس حکم کو تہدیداور تن
پر محمول کرتے ہیں۔ جبکہ غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو قسم کے نظریات ہیں۔

☆ پہلا نظریہ یہ ہے کہ بے نماز کافر تو ہو جاتا ہے۔ مگر ملت اسلام سے خ
نہیں ہوتا اسلئے اس کا جنازہ پڑھنا چاہئے۔ چنانچہ شیخ الکل فی الکل مولانا نذیر ح
صاحب دہلوی مرحوم لکھتے ہیں۔ جن احادیث سے تارک الصلوٰۃ کا کفر ثابت
ہے۔ ان احادیث سے وہ بلاشبہ کافر ہیں اور ان کو کافر کہنا روا ہے۔ مگر ہاں تا
الصلوٰۃ کا کفر ایسا کفر نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے ملت اسلام سے خارج ہو جائے
مغفرت وشفاعت ودخول جنت کا مستحق نہ رہے۔ (فتاوی نذیریہ ص ۴۶۳، ج ۱)
مبارکپوری صاحبؒ نے بھی یہ مسئلہ بیان کرتے ہوئے اسی عبارت کو پیش کیا۔
(ملاحظہ ہو فتاوی ثنائیہ ص ۴۶۷، ج ۱ وفتاوی علمائے حدیث ص ۲۶۳، ج ۴)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں ہاں فی زماننا حسب مصلحت وقت تہ
تارک صلوۃ کو مطلق کافر کہنا جائز ہے۔ نہ یہ کہ مانند کفار غسل وتجہیز وتکفین ونماز جن
سے محروم کیا جائے۔ (فتاوی نذیریہ ص ۵۴۸، ج ۱) اور ایک سوال کے جواب میں
عبارت فتاوی علمائے حدیث ص ۲۷۰، ج ۴ میں بھی پیش کی گئی ہے۔

☆ دوسرا نظریہ بے نماز کے بارہ میں غیر مقلدین حضرات کا یہ ہے کہ وہ ک
ہے اور ملت اسلام سے خارج ہے۔ چنانچہ مولانا عبداللہ امرتسری صاحب مرحوم آ

سوال کے جواب میں فرماتے ہیں۔ہاں نماز ایسا رکن ہے کہ اس کے نہ پڑھنے سے ایمان ہی نہیں رہتا۔(فتاوی اہلحدیث ص ۱۱۶، ج۱) اور ایک مقام پر لکھا ہے کہ بے نماز کا جنازہ نہ پڑھنا چاہئے۔(فتاوی اہلحدیث ص ۴۶، ج ۲) اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں جو کبھی نماز پڑھے اور کبھی نہ پڑھے یا بالکل نماز کا تارک ہو اس کے ساتھ دوستانہ تعلق اور اس کے ساتھ محبت کے طور پر سلوک کرنا یا تحفہ وغیرہ بھیجنا اور ضیافت کرنا بالکل جائز نہیں۔ہاں عام لین دین جیسے ہندوؤں وغیرہ سے کرتے ہیں ان کی دکانوں سے سودا وغیرہ لیتے ہیں اور ان کی دکانوں پر اشیاء وغیرہ فروخت کرتے ہیں اس کا کوئی حرج نہیں۔اور اسی صفحہ پر ایک سوال کے جواب میں پہلے لکھتے ہیں۔۔بے نماز بے شک کافر ہے خواہ ایک نماز کا تارک ہو یا سب نمازوں کا۔(فتاوی اہلحدیث ص ۴۷، ج ۲) اور ایک جگہ لکھا ہے بے نماز کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہئے۔(فتاوی اہلحدیث ص ۴۸، ج ۲) ایک اور مقام میں لکھتے ہیں۔۔بے نماز کی بابت صحیح یہی ہے کہ بالکل کافر ہے۔پس اس کے ساتھ کافروں کا سا سلوک چاہئے۔(فتاوی اہلحدیث ص ۴۸، ج ۲) اور ایک مقام پر لکھتے ہیں بے نماز بے شک کافر ہے خواہ ایک نماز کا تارک ہو یا سب نمازوں کا۔پھر آگے لکھتے ہیں اور بے نماز جب کافر ہوا تو اس کا کھانا مثل عیسائی کے کھانے کے سمجھ لینا چاہئے۔(فتاوی اہلحدیث ص ۳۶۴، ج ۳) اور اسی قسم کا جواب ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث لاہور ص ۶۔۲۹ ستمبر ۲۰۰۰ء میں دیا گیا ہے۔(احناف کے نزدیک جو شخص نماز کی فرضیت کا منکر ہو یا اس حکم کو استخفاف کی نظر سے دیکھتا ہو تو وہ کافر ہے۔اور جو ایسا نہ ہو بلکہ سستی سے نماز کو چھوڑتا ہو وہ کافر نہیں بلکہ فاسق ہے۔(فتاویٰ محمودیہ ص ۱۲۳۔ج ۶ و امداد الفتاویٰ ص ۵۵۰، ج ۱)

بے نماز کی اولاد

غیر مقلدین بے نماز کو کافر کہتے ہیں اور کافر کا تو نکاح ہی معتبر نہیں۔جب اس کا نکاح نہیں تو اولاد کو ولد الحرام ہی کہنا چاہیے مگر یہاں آ کر غیر مقلدین کو احتیاط یاد آ گئی اور یوں کہنے لگے مگر چونکہ بے نماز کا کفر ظنی ہے اس لئے اس کی اولاد کو ولد

الحرام کہنے میں ذرا احتیاط چاہئے۔ (فتاوی اہلحدیث ص ۴۷، ج ۲)

قرآن کریم کی تعظیم

غیر مقلدین حضرات کے نزدیک بے وضو آدمی قرآن کریم کو ہاتھ لگا سک
ہے چنانچہ نواب نورالحسن خان بھوپالی لکھتے ہیں محدث را مس مصحف جائز باشد (عرف
الجادی ص ۱۵) بے وضوء آدمی کیلئے قرآن کریم کو ہاتھ لگانا جائز ہے۔

اور نواب علامہ وحیدالزمان صاحب لکھتے ہیں ولا یمنع الحدث المس
(کنزالحقائق ص ۱۵)

بے وضوء آدمی کیلئے قرآن کریم کو ہاتھ لگانا منع نہیں ہے۔ اسی طرح انہوں
نے اپنی کتاب نزل الابرار ص ۲۶، ج ۱ میں لکھا ہے کہ ہمارے اکثر اصحاب نے بے
وضوء آدمی کیلئے قرآن کریم کو ہاتھ لگانا جائز قرار دیا ہے۔ (احناف کے نزدیک قرآن
کریم کو بے وضوء ہاتھ لگانا درست نہیں ہے۔ فتاوی محمودیہ ص ۱۹، ج ۱ و امداد الاحکام
ص ۲۴۰، ج ۱)

حیض والی عورت کیلئے قرآن کریم کی تلاوت

حیض والی عورت کیا قرآن کریم کی تلاوت کرسکتی ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں
غیر مقلدین کے دو نظریات ہیں۔

☆ پہلا نظریہ یہ ہے کہ ایک دو حرف کی تلاوت تو کرسکتی ہے مگر پوری آیت نہیں
پڑھ سکتی۔ چنانچہ محدث مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں۔ واما قراءة الایة بتمامها
فلایجوز لهما البتة (تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۴، ج ۱) کہ جنبی آدمی اور حیض والی عورت
دونوں کیلئے قرآن کریم کی مکمل آیت کی تلاوت بالکل جائز نہیں ہے۔ اسی طرح نواب
نورالحسن خان بھوپالی لکھتے ہیں وجنب وحائض را در آمدن مسجد وخواندن قرآن حرام
ست نہ حلال (عرف الجادی ص ۱۵) کہ جنبی آدمی اور حیض والی عورت کیلئے مسجد میں آنا
اور قرآن کریم پڑھنا حرام ہے۔ اور ایک مقام میں لکھا ہے حائضہ کو قرآن پڑھنا
پڑھانا اور ہاتھ لگانا منع ہے مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے حائضہ کو

قرآن پڑھنے کو اجازت دی ہے۔ بشرطیکہ زبانی پڑھے۔ (دستور المتقی ص ۵۴)

☆ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اگر حیض والی عورت معلمہ (طالبہ) ہے تو وہ قرآن کریم کی تلاوت بھی کر سکتی ہے اور ہاتھ بھی لگا سکتی ہے۔ چنانچہ علامہ نواب وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں ورخصوا للحائضة المتعلمة فی مس المصحف والتلاوة. (نزل الابرار ص ۲۶۔ ج ۱)

کہ حضرات نے معلمہ یعنی طالبہ کیلئے جبکہ وہ حیض کی حالت میں ہو تو اسکو قرآن کریم کو ہاتھ لگانے اور تلاوت کی اجازت دی ہے۔ اسی طرح وہ اپنی کتاب کنز الحقائق ص ۱۵ میں بھی حیض میں مبتلا طالبہ کیلئے قرآن کریم کو ہاتھ لگانے اور تلاوت کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ (احناف کے نزدیک حیض والی عورت اور جنبی آدمی نہ قرآن کریم کی تلاوت کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ اور قرآن پاک پڑھنے سے مراد پوری آیت پڑھنا ہے۔ امداد الفتاویٰ ص ۵۰، ج ۱)

تعظیم قبلہ

مسلمان قبلہ کی تعظیم کرتے ہیں اور ہر ایسے کام سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں جو قبلہ کی توہین کا باعث ہو اور جمہور مسلمان قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرکے پیشاب وغیرہ کرنے کو اور اسی طرح بلا عذر قبلہ کی جانب پاؤں پھیلانے کو بھی تعظیم کے خلاف سمجھتے ہیں مگر غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو نظریات ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ تعمیر شدہ بیت الخلاء میں اگر کوئی بیٹھ کر پیشاب وغیرہ کرے تو پھر قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ایک سوال میں لکھا گیا کہ قضاء حاجت کا کیا طریقہ ہے؟ تو جواب دیا گیا کہ بیٹھنے کے وقت زمین سے قریب ہو کر کپڑا اٹھانا چاہیئے قبلہ کی طرف منہ اور پیٹھ کرنے سے پرہیز رکھے۔ ہاں اگر آگے پردہ ہو تو کوئی حرج نہیں (فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۵۱، ج ۱) اسی طرح قضاء حاجت کے مسائل بیان کرتے ہوئے لکھا گیا پیشاب پاخانہ کرتے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا یا پیٹھ کرنا منع ہے۔ بیت الخلاء میں بوقت ضرورت جائز ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص

۴۳، ج ۱)

☆ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ پیشاب و پاخانہ کی حالت میں قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا منع ہے۔ خواہ کھلی جگہ ہو یا تعمیر شدہ بیت الخلاء ہو۔ چنانچہ نواب نور الحسن خان بھوپالی لکھتے ہیں واستقبال واستدبار قبلہ نزد ریدن وشاشیدن (عرف الجادی ص ۱۱) کہ پیشاب اور پاخانہ کی حالت میں قبلہ کی طرف منہ یا پیٹھ کرنا منع ہے۔ اسی طرح محدث مبارکپوری صاحب مرحوم اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ فالحاصل ان اولی الاقوال واقواھا عندی واللہ اعلم ھو قول من قال انہ لایجوز الاستقبال والاستدبار مطلقا (تحفۃ الاحوذی ص ۲۰، ج ۱) تو اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ان اقوال میں سے سب سے بہتر اور قوی قول میرے نزدیک ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مطلقا (خواہ کھلی جگہ ہو یا بیت الخلاء میں) قبلہ کی طرف منہ کرنا اور پیٹھ کرنا منع ہے۔ واللہ اعلم۔ (احناف کے نزدیک خواہ تعمیر شدہ بیت الخلاء ہو یا کھلی جگہ ہو ہر لحاظ سے پیشاب اور پاخانہ کے وقت اسکی طرف منہ کرنا اور پیٹھ کرنا منع ہے۔ خیر الفتاویٰ ص ۱۷۵، ج ۲)

قبلہ کی طرف پاؤں کرنا

جمہور مسلمان تو قبلہ کی طرف بلا عذر پاؤں کرنے کو تعظیم کے خلاف سمجھتے ہیں۔ مگر غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو نظریات ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ پاؤں قبلہ رخ کرنا جائز ہے اس بارہ میں ہفت روزہ الاعتصام لاہور میں مولانا عبداللہ شفیق صاحب کا مستقل ایک مضمون شائع ہوا تھا۔

☆ دوسرا نظریہ کہ بلا عذر قبلہ کی طرف پاؤں کرنا خلاف ادب ہے۔ چنانچہ مولانا عبداللہ شفیق صاحب کے مضمون کے جواب میں پیر سید محب اللہ شاہ راشدی صاحب کا مضمون شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے یوں لکھا بہر حال جب بیت اللہ یا قبلہ کی تعظیم شرعا مطلوب ہے۔ تو راقم الحروف کے خیال میں جن لوگوں کے ہاں قبلہ کی طرف پاؤں دراز کرنا سوء ادبی میں داخل ہے۔ انہیں بہر حال اس سے اجتناب کرنا

ل والمشل ہے (ملاحظہ ہوالاعتصام لاہور ص ۱۸۔۱۱ محرم ۱۴۱۴ھ)
احناف کے نزدیک نیند یا اس کے علاوہ حالت میں قبلہ کی جانب جان بوجھ کر پاؤں کرنا مکروہ ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۸۶، ج ۱)

افسوسناک بات

بعض مساجد کے بیت الخلاء دیکھنے کا اتفاق ہوا جن کے رخ قبلہ کی جانب ہیں معلومات کرنے پر معلوم ہوا کہ مستری غیر مقلد تھے اور انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ پیچھے دیوار یا دروازہ موجود ہے۔ اسی طرح بعض مکانات اور کوٹھیوں کے بیت الخلاؤں کا رخ بھی قبلہ کی جانب دیکھنے کا اتفاق ہوا جب صاحب خانہ سے بات ہوئی تو کہنے لگے کہ مستری صاحب نے کہا کہ جگہ ہی ایسی ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ معمولی محنت سے ان کے رخ درست کیئے جاسکتے تھے مگر جاہل غیر مقلد مستری اور کیمونسٹ ذہن کے انجینئرز جن کے ہاں تعظیم قبلہ کی کوئی حیثیت ہی نہیں وہ ایسے نقشے بنا دیتے ہیں کہ مسلمان ساری عمر کیلئے گناہ میں پھنس جاتے ہیں۔ اس لئے ہماری مسلمانوں سے گذارش ہے کہ کوئی بھی تعمیر کرتے وقت سب سے پہلے بیت الخلاؤں کے رخ کا نقشہ ضرور دیکھ لیا کریں اور غیر مقلد غالی مستریوں کو سختی سے منع کر دیا کریں کہ تم اپنا نظریہ اپنے پاس رکھو اور ہماری عمارت میں ہماری خواہش اور نظریہ کے مطابق عمل کرو۔ جمہور مسلمانوں کے نزدیک پیشاب اور پاخانہ کی حالت میں کھلی جگہ ہو یا تعمیر شدہ بیت الخلاء ہو ہر حال میں قبلہ کی طرف منہ کرنا یا پیٹھ کرنا حرام ہے۔ جبکہ معمولی سی بے توجہی کی وجہ سے بعض مسلمان ساری زندگی حرام کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سمجھ نصیب فرمائے۔

پانی کی طہارت ونجاست کا مسئلہ

اگر پانی موجود ہو اور پانی کے استعمال پر آدمی کو قدرت بھی ہو تو طہارت صرف پانی سے ہوسکتی ہے۔ اسلئے پانی کی اہمیت بالکل واضح ہے۔ اگر پانی میں نجاست گر جائے تو کیا وہ پانی ناپاک ہوتا ہے یا نہیں۔ اس بارہ میں غیر مقلدین کے

تین نظریات ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ پانی خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ جب تک اس میں نجاست کے اثرات (رنگ۔ بو۔ اور ذائقہ) میں سے کوئی ایک اثر ظاہر نہیں ہوتا اس وقت تک پانی پاک ہی رہتا ہے چنانچہ ایک سوال ہوا کہ پانی ناپاک کس طرح ہوتا ہے؟ تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ پانی جتنا بھی ہو پاک ہے جب تک اس میں کوئی ناپاک چیز اتنی نہ گرے جس سے اس کی بو یا مزہ یا رنگ بدل جائے (فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۱۴، ج ۱)

علامہ نواب وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں وکذالک بماء لم یتغیر احد اوصافه بوقوع النجاسة فیه وان کان قلیلا او راکدا (نزل الابرار ص ۲۹، ج ۱) اسی طرح پانی کے ساتھ بھی طہارت حاصل کی جاسکتی ہے جسمیں نجاست گرنے سے اس کا کوئی ایک وصف تبدیل نہ ہو خواہ پانی تھوڑا ہو یا ٹھہرا ہوا ہو۔

اور نواب نور الحسن خان صاحب بھوپالی لکھتے ہیں۔ مگر بنجاستے کہ بو یا مزہ رنگ او را بر گرداند (عرف الجادی ص ۹) ہر پانی سے طہارت حاصل کی جاسکتی ہے مگر وہ پانی جس میں اتنی نجاست گرے جو کہ اس پانی کی بو یا مزہ یا رنگ کو تبدیل کر دے۔ اسی طرح مولانا محمد اسماعیل صاحب مرحوم لکھتے ہیں اس حدیث سے ظاہر ہے کہ اگر پلیدی گرنے سے پانی کی ان صفات میں سے کوئی ایک بدل جائے تو پانی پلید ہو جائے گا۔ (رسول اکرم کی نماز ص ۱۲) اس نظریہ والوں کے نزدیک کوئی ایک وصف بھی نجاست کا پانی پر ظاہر ہو جائے تو پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ پانی میں گرنے والی نجاست کے تینوں اوصاف اکٹھے پائے جائیں تو پانی ناپاک ہوگا ورنہ نہیں چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں حضورؐ فرماتے ہیں کہ (اگر نجاست کے گرنے سے) پانی سے بدبو آنے لگے یا اس کا مزہ بگڑ جائے یا رنگ تبدیل ہو جائے (یعنی تینوں وصف پانی میں اکٹھے پائے جائیں) تو وہ پانی ناپاک (ہو جاتا) ہے۔ (صلوۃ رسول ص ۵۳)

☆ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ اگر پانی تھوڑا ہو اور اس میں نجاست گر جائے تو بیشک

اس نجاست کا اثر پانی پر ظاہر نہ بھی ہو تب بھی وہ پانی ناپاک ہو جاتا ہے اور اگر پانی زیادہ ہو تو جب تک اسمیں نجاست کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا اس وقت تک وہ پانی پاک ہی رہتا ہے۔ چنانچہ ایک سوال ہوا اگر ایک جوتی استعمالی اندرون چاہ سے نکلی اور وہ جوتی سائیس کی تھی اور اس چاہ میں پانی کثرت سے نہیں ہے۔ یعنی اس پانی کا حکم پوچھا تو جواب دیا اگر جوتی مندرجہ سوال ناپاک ہے۔ تو سارا پانی چاہ کا نکالنا آتا ہے (فتاویٰ نذیریہ ص ۳۴۲، ج۱) اسی طرح سوال ہوا کہ ناپاک گیند کنویں میں گر گیا تو اس کنویں کے پانی کا کیا حکم ہے تو جواب دیا گیا پس اس حالت میں بحالت گیند ناپاک کے کنویں میں وہ چاہ ناپاک ہو گیا (فتاویٰ نذیریہ ص ۳۴۲، ج۱) یعنی ایک ناپاک جوتی یا گیند گرنے کی وجہ سے کنویں کا سارا پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور غیر مقلد عالم مولانا عبید اللہ مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں وفیہ ایضا ان الماء القلیل ینجس بوقوع النجاسة فیه وان لم یتغیر (مرعاة المفاتیح ص ۵۵۳، ج۱) تھوڑے پانی میں نجاست گرنے سے بیشک پانی میں تبدیلی نہ آئے تب بھی وہ پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ (احناف کے نزدیک تھوڑے پانی میں معمولی سی نجاست بھی گر جائے تو وہ پانی ناپاک ہو جاتا ہے اور پانی زیادہ ہو تو پھر جب نجاست کا اثر اس پر ظاہر ہو گا تو تب ناپاک ہو گا اور زیادہ پانی کے بارہ میں لوگوں کی آسانی کیلئے سمجھایا گیا کہ دہ دردہ ہو تو پانی کثیر ہے۔)

کتے کا جوٹھا

کتے کے جوٹھے کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ یہ کہ کتے کا جوٹھا پاک ہے چنانچہ علامہ نواب وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں واختلفوا فی لعاب الکلب والخنزیر وسورهما والارجح طهارته (نزل الابرار ص ۴۹، ج۱) کتے اور خنزیر کے لعاب اور ان کے جوٹھے پانی کے بارہ میں علماء نے اختلاف کیا ہے اور زیادہ راجح بات یہ ہے کہ وہ پاک ہے۔

☆ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کتے کا جوٹھا ناپاک ہے چنانچہ کتے کے جوٹھے کے بارہ

میں سوال ہوا تو جواب دیا گیا کہ کتے کا جوٹھا ناپاک ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۳۸، ج ۱) اور مولانا عبید اللہ مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں **وفی الحدیث دلیل علی نجاسة فم الکلب** (مرعاۃ المفاتیح ص ۵۵۳، ج ۱) اس حدیث میں کتے کے منہ کے ناپاک ہونے پر دلیل ہے۔ (احناف کے نزدیک کتے کا لعاب نجس ہے۔ فتاویٰ محمودیہ ص ۲۳، ج ۱۲ اسلئے اس کا جوٹھا ناپاک ہے۔)

جرابوں پر مسح

جرابوں پر مسح کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں

☆ پہلا نظریہ کہ ہر قسم کی جرابوں پر مسح جائز ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں سوال ہوا تو جواب دیا گیا کہ پائتابہ (جراب) پر مسح کرنا آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے (فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۴۱، ج ۱) مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی جرابوں پر مسح کی بحث کر کے آخر میں فرماتے ہیں پس ثابت ہوا کہ جورب پاؤں کے لفافے یا لباس کو کہتے ہیں وہ لباس خواہ چرمی ہو، خواہ سوتی یا اونی وغیرہ ہم اس پر مسح کر سکتے ہیں (صلوۃ رسول ص ۱۱۱)

☆ دوسرا نظریہ کہ پتلی جرابوں پر مسح کرنا درست نہیں ہے چنانچہ ایک سوال کے جواب میں حضرت مولانا ابو البرکات صاحب لکھتے ہیں جسکی تصدیق محدث گوندلوی مرحوم نے کی ہے جرابوں پر مسح والی حدیث ضعیف ہے جس سے قرآن کی تخصیص درست نہیں لہٰذا ہم شرط لگاتے ہیں کہ جرابیں موٹی ہونے کی صورت میں مسح جائز ہے۔ اگر موٹی نہیں تو پھر جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۲۲۴)

ایک سوال کے جواب میں مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں **المسح علی الجوربة لیس بجائز لانه لم یقم علی جوازه دلیل صحیح** (فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۴۳، ج ۱) کہ جرابوں پر مسح جائز نہیں ہے اسلئے کہ اس کے جواز پر کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔

مولانا ابو سعید شرف الدین صاحب دہلوی فرماتے ہیں جرابوں پر مسح والا

مسلک صحیح نہیں ہے اس لئے کہ دلیل صحیح نہیں ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۴۱، ج املخصاً)
ایک سوال ہوا کہ اونی اور سوتی جرابوں پر مسح جائز ہے یا نہیں؟ تو جواب دیا گیا مذکورہ جرابوں پر مسح جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۳۲۷، ج ۱) اور اس قسم کے سوال کا اسی قسم کا جواب فتاویٰ علمائے حدیث ص ۹۲، ج ۱ میں بھی دیا گیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے اور پتلی جرابوں پر مسح کرنا ناجائز ہے مسح جراب کی اکثر حدیثیں ضعیف ہیں۔ (دستور المتقی ص ۸۷) (احناف کے نزدیک عام جرابوں پر مسح کرنا درست نہیں ہے۔ اگر ان کے نیچے یا اوپر چمڑا لگایا گیا ہو یا اتنی موٹی ہوں کہ چمڑے کے موزہ کے قریب قریب ان سے کام لیا جا سکتا ہو تو ان پر مسح ہو سکتا ہے۔

ناخن پالش کی صورت میں وضوء ہوتا ہے یا نہیں؟

اس بارہ میں غیر مقلدین حضرات کے دو نظریئے ہیں

☆ پہلا نظریہ کہ ناخن پالش مہندی کی قسم ہے اسلئے وضوء ہو جاتا ہے چنانچہ اس بارہ میں سوال ہوا تو جواب دیا گیا ناخن پالش مہندی کی قسم سے ہے مہندی کا رنگ بھی دو تین دفعہ لگانے سے گاڑھا ہو جاتا ہے جو بالاتفاق جائز ہے۔ ایسا ہی ناخن پالش کو سمجھ لینا چاہئے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۱، ج ۲) یہی جواب فتاویٰ علمائے حدیث ص ۶۹، ج ۱) میں اور ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث ص ۵۔ ۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء میں دیا گیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ناخن پالش سے وضوء نہیں ہوتا چنانچہ اس بارہ میں ایک سوال کا جواب دیا گیا۔ جب تک ناخن پالش کو کرید کر تہہ نہ اتاریں وضوء نہیں ہوتا (فتاویٰ برکاتیہ ص ۲۰) اور ہفت روزہ میں ناخن پالش سے وضوء کے بارہ ہی سوال ہوا تو جواب دیا گیا ناخن پالش سے وضوء نہیں ہوتا۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص ۱۳۔ ۱۷ رمضان ۱۴۱۸ھ) (احناف کے نزدیک ناخن پالش کی صورت میں وضوء اور غسل نہیں ہوتا۔ احسن الفتاویٰ ص ۲۶، ج ۲۔ خیر الفتاویٰ ص ۴۹، ج ۲)

کانوں کا مسح

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ سر کا مسح کرنے کے بعد ہاتھوں پر جو تری رہ جاتی ہے اسی کے ساتھ کانوں کا مسح کیا جائے چنانچہ علامہ وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں ومسح الاذنین بماء بقی بعد مسح الرأس (کنز الحقائق ص ۱۱) کہ سر کے مسح کے بعد جو پانی ہاتھوں پر باقی رہ جائے اس کے ساتھ دونوں کانوں کا مسح کرنا۔ اسی طرح وہ دوسرے مقام میں لکھتے ہیں کہ سر کے مسح کے بعد جو پانی باقی بچے اس کے ساتھ کانوں اور کنپٹیوں کا مسح کرے اور اگر سر کے مسح کے بعد ہاتھ پگڑی یا کپڑے کو لگ جائے تو پھر کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لینا مستحب ہے۔ (نزل الابرار ص ۱۶، ج ۱)

ایک سوال کے جواب میں کہا گیا یعنی کانوں اور سر کو پانی ایک ہی کافی ہے (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۰۲، ج ۱ اور یہی جواب فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۳۰، ج ۱ میں بھی دیا گیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لے۔ چنانچہ فتاویٰ علمائے حدیث اور فتاویٰ ثنائیہ میں جو جواب دیا گیا اس پر مولانا ابو سعید شرف الدین صاحب لکھتے ہیں کہ نیا پانی لینا راجح ہے۔ (بحوالہ مذکورہ صفحات)

مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں اور کانوں کے مسح کیلئے نیا پانی لیں (صلوٰۃ رسول ص ۸۲) اور مولانا محمد یونس دہلوی لکھتے ہیں پھر کانوں کے مسح کرنے کیلئے بھی نیا پانی لیں۔ (دستور المتقی ص ۴۷)

(احناف کے نزدیک اگر سر کے مسح کے بعد ہاتھوں پر تری باقی ہو تو اسی کے ساتھ کانوں کا مسح کر لیا جائے ایسی حالت میں نیا پانی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا کہ ہدایہ ص ۱۸، ج ۱ میں ہے۔ وھو سنۃ بماء الرأس کہ کانوں کا مسح سر کے مسح سے بچے ہوئے پانی کے ساتھ مسنون ہے۔)

کیا پاجامہ ٹخنے سے نیچے ہونے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے تین نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ وضوء ٹوٹ جاتا ہے چنانچہ غیر مقلد عالم شیخ الحدیث مولانا محمد

یونس صاحب لکھتے ہیں ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہننے والوں کو از سر نو وضوء کرنا چاہئے۔ (دستور المتقی ص ۸۷) اور یہی بات فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۳۳، ج ۱ میں لکھی گئی ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ ایسی صورت میں احتیاطاً وضوء کر لینا چاہئے۔ چنانچہ اس بارہ میں سوال کے جواب میں کہا گیا احتیاط بہتر ہے کہ دوبارہ وضوء کر لیں۔ (فتاوی برکاتیہ ص ۲۰)

☆ تیسرا نظریہ کہ وضوء نہیں ٹوٹتا۔ چنانچہ اسی بارہ میں سوال ہوا تو جواب دیا گیا صورت مرقومہ میں وضوء نہیں ٹوٹتا ناقض وضوء حدیث ضعیف ناقابل حجت ہے۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص ۷۔ ۱۷ ذوالقعدہ ۱۴۱۴ھ)

(احناف کے نزدیک شلوار یا تہہ بند کو ٹخنوں سے نیچے کرنا مردوں کیلئے جائز نہیں ہے مگر اسکی وجہ سے وضوء نہیں ٹوٹتا)

سحری کی اذان

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں کہ فجر کی نماز سے پہلے جو دو اذانیں ہوتی تھیں کیا وہ دونوں فجر کیلئے ہوتی تھیں یا ایک سحری اور ایک فجر کیلئے ہوتی تھی۔

☆ پہلا نظریہ یہ ہے کہ ایک اذان سحری کی ہوتی تھی اور دوسری فجر کی نماز کیلئے۔ چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں یعنی بلالؓ کی اذان سن کر سحری کھانا نہ چھوڑا کرو کیونکہ وہ اذان رات کو سحری کیلئے دیتا ہے۔ (صلوٰۃ رسول ص ۱۶۸)

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے اس بیان سے ایک تو سحری کی اذان ثابت ہوئی دوم یہ معلوم ہوا کہ اس اذان کی غرض وہ نہیں جو عام اذان کی ہے اور پھر آگے لکھا ہے کہ دونوں اذانوں کے درمیان اندازہ تقریباً ایک گھنٹہ ہو سکتا ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۶۳، ج ۲)

ایک سوال ہوا کہ رمضان شریف میں سحری کھانے کیلئے اذان دے سکتے ہیں یا نہیں تو جواب دیا گیا اذان دے سکتے ہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۵۲، ج ۱)

☆ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ دونوں اذانیں فجر کیلئے ہوتی تھیں چنانچہ مولانا ابوالبرکات احمد صاحب مرحوم سے سوال ہوا کیا سحری یا تہجد کی اذان کا حدیث میں ثبوت ہے تو جواب دیا کہ حدیث سے فجر کی دو اذانیں ثابت ہیں پھر آگے لکھتے ہیں کہ دونوں اذانوں کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہے کہ ایک اذان کہہ کر اترا اور دوسرے نے اوپر چڑھ کر اذان کہہ دی اس سے واضح ہو گیا کہ دونوں اذانیں فجر کیلئے ہی ہیں۔ سحری یا تہجد کے نام پر کوئی اذان حدیث میں نہیں ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۲۲) (احناف کے نزدیک تہجد کیلئے سحری کی اذان منسوخ ہو چکی ہے۔ احسن الفتاویٰ ص ۲۹۱، ج ۲۔ وخیر الفتاویٰ ص ۲۰۶، ج ۲)

جمعہ کی پہلی اذان کا حکم

بعض غیر مقلدین جمعہ کی پہلی اذان کو بدعت کہتے ہیں اور بعض جائز کہتے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ جمعہ کی پہلی اذان جس کو اذان عثمانی کہا جاتا ہے یہ بدعت ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا پس جس نے ایک اذان و اقامت پر اکتفا کیا اس نے نبی صلعم اور خلفاء کا اتباع کیا۔ جس نے اس پر زیادتی کی اس نے ہی آپ کے فرمان علیکم بسنتی کے خلاف کیا مرتکب بدعت ہوا۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۳۴، ج ۱) ایک مقام میں لکھا ہے مولانا محمد جونا گڑھی نے اس اذان کو بدعت قرار دیتے ہوئے لکھا ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۰۶، ج ۲)

☆ دوسرا نظریہ کہ اذان عثمانی یعنی جمعہ کی پہلی اذان جائز ہے اس کو بدعت کہنا درست نہیں ہے۔ ایک سوال کے جواب میں مولانا ابوالبرکات احمد مرحوم لکھتے ہیں۔ مدینہ کی آبادی کی وسعت کے پیش نظر صحابہؓ سے مشورہ کر کے حضرت عثمانؓ نے یہ اذان جاری کی تھی اس کو بدعت کہنا درست نہیں ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۲۲)

ایک سوال ہوا کہ جمعہ کے دن اگر اذان عثمانی نہ دی جائے تو کیا اسکی کوئی پکڑ ہے یا نا جائز؟ تو جواب دیا گیا (ایسا کرنا) علیکم بسنتی و سنة الخلفاء

الراشدین کے خلاف ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۳۴، ج ۱)

ایک مقام میں لکھا ہے خلاصہ یہ کہ مَارَاٰهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا حدیث کے تحت عثمانی اذان درست ہے کیونکہ اس وقت قریباً سب شہروں میں جاری ہوگئی ہے اِلَّا ماشاء اللہ۔ فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۰۳، ج ۲) ایک سوال ہوا کہ جمعہ میں دو اذانیں سنت ہیں تو جواب دیا گیا میرے نزدیک بروز جمعہ دو اذان سنت ہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۷۷، ج ۲)

(جمعہ کی دونوں اذانیں احناف کے نزدیک درست ہیں اور اسی پر امت کا تعامل چلا آ رہا ہے)

رفع یدین کا حکم

نماز میں رکوع جاتے وقت اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے اس کے حکم میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ یہ امر مستحب ہے اس کے نہ کرنے سے نماز میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک سوال کا جواب دے کر مولانا ثناء اللہ صاحب کی تشریح نقل کی جس میں ہے۔ اہل حدیث کا مذہب ہے کہ نماز میں رکوع کرتے ہوئے اور اس سے سر اٹھاتے ہوئے ہاتھ مثل تکبیر تحریمہ کانوں تک اٹھانے مستحب ہیں۔ اور آگے لکھا ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے رفع یدین ایک مستحب امر ہے جس کے کرنے پر ثواب ملتا ہے اور نہ کرنے سے نماز کی صحت میں کوئی خلل نہیں آتا (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۵۳، ۱۵۴، ج ۳)

دوسرے مقام پر لکھا ہے قصہ مختصر رفع یدین کا ثبوت اور عدم ثبوت دونوں مروی ہیں (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۶۳، ج ۳) اور ہفت روزہ میں اس بارہ میں سوال ہوا تو فتاویٰ نذیریہ ص ۲۲۱، ج ۱ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رفع یدین کرنا اور نہ کرنا دونوں ثابت ہیں۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۷۔ ۱۳ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ) اور مولانا امرتسری مرحوم لکھتے ہیں۔ ہمارا مذہب ہے رفع یدین ایک مستحب امر ہے (اہلحدیث کا

مذہب ص ۷۱-۷۲)

ایک اور مقام میں لکھا ہے حافظ ابن قیم نے زادالمعاد میں لکھا ہے کہ قنوت کا مسئلہ مختلف فیہ ہے اور یہ اختلاف مباح ہے اور اس کے کرنے والے اور نہ کرنے والے پر کوئی ملامت نہیں ہے جیسے نماز میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا اور مانند اختلاف تشہد اور اذان اور اقامت کے اور مانند اختلاف حج کے جو افراد اور قران اور تمتع ہے سلف صالحین نے دونوں طرح کیا ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث حاشیہ نمبر ۲، ص ۱۵۱-۱۵۲، ج ۳)

☆ دوسرا نظریہ کہ رفع یدین نہ کرنے سے نماز میں خلل آتا ہے چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں ہر مسلمان رفع یدین کے ساتھ نماز پڑھے کہ اس کے بغیر نماز کا یقیناً نقصان ہے۔ (صلوۃ رسول ص ۲۴۳) ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے اس لئے احتیاط رفع یدین کرنے ہی میں ہے نہ کرنے میں خطرہ ہے کہ نماز میں نقص آئے (فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۲۳، ج ۲) ایک ہفت روزہ میں ایک سوال کا جواب دیا گیا۔ اس لئے احتیاط رفع یدین کرنے ہی میں ہے نہ کرنے میں خطرہ ہے کہ نماز میں نقص آئے۔ (ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث لاہور ص ۵،۲ جون ۲۰۰۰ء)

ایک اور سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ رفع یدین عمداً چھوڑنے سے خطرہ ہے کہ نماز میں نقص پیدا ہوگا۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۵، یکم محرم الحرام ۱۴۱۸ھ)

(احناف کے نزدیک رکوع جاتے اور اٹھتے وقت اور تیسری رکعت کیلئے کھڑے ہوتے وقت اور اسی طرح سجدوں کیلئے رفع یدین نہ کرنا افضل اور بہتر ہے۔ تفصیل کیلئے خزائن السنن ص ۳۴۱ دیکھیں)

نماز میں رفع یدین کتنی جگہ ہے

اس بارہ میں غیر مقلدین کے تین نظریات ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ رفع یدین تین جگہ ہے۔ چنانچہ ایک سوال کا جواب دیا گیا کہ وہ تمام روایات جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک جم غفیر کے راستے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی

ان میں صرف تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے اول تکبیر تحریمہ کے وقت ۔ دوم رکوع کے وقت سوم رکوع سے اٹھتے وقت اور آگے لکھا ہے بلکہ تمام روایات میں رفع یدین کا ذکر تین جگہوں پر ہے اور اس کے خلاف جو کچھ بھی وارد ہوا ہے اگر ثقہ کی روایت بھی ہے تو وہ شاذ ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۲۸، ج ۳) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تیسری رکعت کو اٹھتے وقت رفع یدین نہیں ہے۔

دوسرا نظریہ کہ رفع یدین چار جگہ ہے۔ تکبیر تحریمہ کے وقت، رکوع کو جاتے وقت، رکوع سے اٹھتے وقت اور تیسری رکعت کو اٹھتے وقت۔ چنانچہ لکھا گیا ہے مواضع رفع یدین چار ہیں (حاشیہ نمبر ۱، فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۲۸، ج ۳) اور اکثر اسی نظریہ کی تشہیر آج کل غیر مقلدین کر رہے ہیں۔

تیسرا نظریہ کہ ان چار مقامات کے علاوہ سجدہ کو جاتے اور اٹھتے وقت بھی رفع یدین ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ سجدہ کو جاتے اور دو سجدوں کے درمیان رفع یدین کرنے والا مصیب ہے اور سجدہ کو جاتے اور بین السجدتین رفع یدین والی حدیث صحیح ہے یہ حدیث تغافل یا تساہل کی وجہ سے متروک العمل ہوئی ورنہ کوئی وجہ ترک کی نہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۰۶، ج ۴)

اور ایک جگہ لکھا ہے کہ علامہ البانی نے اپنی کتاب صفۃ الصلوۃ میں سجدہ جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کو سنت کہا ہے۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۸، ۱۱ اگست ۱۹۹۵ء) اور غیر مقلد عالم محمد حسین صاحب سلفی نے سجدوں میں رفع یدین سنت ہے کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے۔

تکبیرات عیدین میں رفع یدین

عید کی نماز میں جو زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں کیا ان تکبیرات کے وقت ہاتھ اٹھانے چاہئیں یا نہیں؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

پہلا نظریہ کہ ہاتھ نہیں اٹھانے چاہئیں۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا اور تکبیرات عیدین میں رفع یدین نہ کرنا چاہئے کیونکہ ثابت نہیں۔ (فتاویٰ

نذیریہ ص ۴۵۴، ج ۱) اور یہی جواب فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۵۸، ج ۳ میں دیا گیا ہے۔ اور ایک سوال کے جواب میں کہا گیا تکبیرات عیدین میں رفع الیدین کی کوئی مرفوع صریح صحیح یا ضعیف روایت وارد نہیں (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص ۹، شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ)

☆ دوسرا نظریہ کہ عیدین کی ہر ہر تکبیر پر رفع یدین ہے چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں ہر ہر تکبیر پر رفع الیدین کریں اور ہر تکبیر پر ہاتھ باندھ لیا کریں (صلوۃ رسول ص ۴۱۰) ایک سوال کے جواب میں کہا گیا صحیح ترین طریقہ نماز عید کا بعد تکبیر اول کے سات تکبیریں زائد سنت ہیں۔ دوسری رکعت میں کھڑے ہوتے ہی پانچ تکبیریں زائد سنت ہیں ہر تکبیر کے بعد رفع یدین کرنا سنت ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۱۳، ج ۱)

(احناف کے نزدیک عیدین کی نماز میں زائد تکبیروں کے وقت رفع یدین کرنا چاہئے۔ (ہدایہ ص ۱۷۴، ج ۱)

وتروں میں دعائے قنوت پر رفع یدین

غیر مقلدین حضرات وتروں میں دعائے قنوت کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو اعتراف ہے کہ اس بارہ میں صحیح کوئی روایت نہیں ہے۔ اس کے باوجود اکثر غیر مقلدین حضرات وتروں میں ہاتھ اٹھانے کو پسند کرتے ہیں جبکہ ایک گروہ کہتا ہے کہ ہاتھ اٹھانا یا نہ اٹھانا دونوں برابر ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ وتروں میں قنوت کے وقت ہاتھ اٹھانے چاہئیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے دیکھئے وتروں میں مغفرت کی دعا ہاتھ اٹھا کر کی جاتی ہے حالانکہ اس بارہ میں کوئی حدیث موجود نہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۹۶، ج ۵) ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا صحیح حدیث سے صراحۃً ہاتھ اٹھا کر یا باندھ کر قنوت پڑھنے کا ثبوت نہیں ملتا ہے دعا ہونے کی حیثیت سے ہاتھ اٹھا کر پڑھنا اولیٰ ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۰۶، ج ۳) اور ایک مقام میں لکھا ہے لیکن اشبہ یہ ہے کہ دعا بعد از رکوع

کی صورت میں قنوت نازلہ پر قیاس کرتے ہوئے رفع الیدین کیا جائے۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص ۸۔ ۱۳ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ)

☆☆ دوسرا نظریہ کہ وتروں میں دعاء قنوت ہاتھ اٹھا کر کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں مولانا ابوالبرکات احمد صاحب مرحوم لکھتے ہیں امام ابن تیمیہؒ نے فتاویٰ کبریٰ میں لکھا ہے کہ وتر میں قنوت پڑھو یا نہ پڑھو ہاتھ اٹھا کر دعا کرو یا نہ کرو سب برابر ہے۔ اقرب الی الصواب یہی ہے جو ابن تیمیہؒ نے فرمایا ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۳۸)

(احناف کے نزدیک دعائے قنوت سے پہلے ہاتھ اٹھانے چاہییں جیسا کہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ خزائن السنن ص ۴۱۶۔ ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنا درست نہیں ہے)

وتروں میں دعائے قنوت کا محل

وتروں میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے کرنی چاہئے یا رکوع کے بعد اس کے بارہ میں غیر مقلدین حضرات کے دو نظریئے ہیں۔

☆☆ پہلا نظریہ کہ رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھنی چاہئے چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب مرحوم لکھتے ہیں دعاء قنوت یہ ہے جو آخری رکعت میں بعد رکوع پڑھتے ہیں۔ (صلوۃ رسول ص ۴۵۹) ایک سوال کے جواب میں کہا گیا وتروں میں دعائے قنوت کا محل بعد از رکوع ہے۔ (ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث ص ۶، ۱۷ دسمبر ۱۹۹۹ء) آج کل اکثر غیر مقلدین کا اسی طریقہ پر عمل ہے۔

☆☆ دوسرا نظریہ کہ دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھنی چاہئے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا قنوت قبل الرکوع افضل ہے۔ ہاتھ اٹھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص ۸۔ ۲۸ ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ)

ایک اور جگہ لکھا گیا دعائے قنوت قبل از رکوع اور بعد از رکوع دونوں طرح

درست ہے۔ البتہ اولیٰ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قبل از رکوع مانگی جائے۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۱۰۔ یکم صفر ۱۴۱۶ھ) نماز وتر میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھنی چاہئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل اور صحابہ کرام کا عمل اس کے مطابق تھا (ہفت روزہ الاعتصام ص ۱۳۔ ۲۷ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ)

آمین کس طرح کہنی چاہئے

غیر مقلدین حضرات آمین بلند آواز سے کہنے کو ہی سنت بتاتے ہیں حالانکہ اس بارہ میں ان کے خود دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ اونچی آواز سے آمین ہی سنت ہے۔ چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم آمین کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں حنفی بھائیو آپ بھی اونچی آمین کہا کرو کہ سنت ہے (صلوٰۃ رسول ص ۱۹۸) اور اس سے پہلے لکھتے ہیں جب مسجد نبوی پونے چودہ سو سال سے اونچی آمین کی آواز سے گونج رہی ہے تو برادران احناف کی مساجد کیوں خاموش ہیں؟ بھائیو زندہ کرو اس سنت کو۔ (صلوٰۃ رسول ص ۱۹۷) اسی طرح نواب علامہ وحید الزمان نے نزل الابرار ص ۷۶، ج ا اور کنز الحقائق ص ۲۰ میں اونچی آواز سے آمین کو سنت قرار دیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ آمین زور سے اور آہستہ دونوں طرح کہنا درست ہے چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا احادیث میں زور سے آمین کرنا اور آہستہ آمین کرنا بھی آیا ہے۔ ان دو میں سے جس طرح بھی آمین کہی جائے وہ شرک وکفر نہیں اور نہ بدعت ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۸۷، ج ۲)

علامہ نواب نور الحسن خان صاحب لکھتے ہیں وآثار در خفض ورفع آمین ہر دو وارد شدہ وبصحت رسیدہ وثانی اولیٰ تر است (عرف الجادی ص ۲۹۔ ۳۰) آمین اونچی اور آہستہ کہنے کے بارہ میں دونوں طرح کے آثار پائے جاتے ہیں اور وہ درجہ صحت کو پہنچے ہوئے ہیں اور دوسرا پہلو راجح ہے۔ اور غیر مقلدین کے شیخ الکل فی الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی مرحوم ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں لیکن

معاملہ آسان ہے۔ آمین کہنا سنت ہے اور آہستہ یا بلند کہنا مستحب ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۴۴۸، ج۱)

(احناف کے نزدیک امام اور مقتدیوں کو آمین آہستہ کہنا بہتر ہے۔ خزائن السنن ص ۳۳۲)

رکوع سے اٹھ کر امام کیا کہے؟

غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ امام صرف سمع اللہ لمن حمدہ کہے چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں اگر آپ امام ہیں تو رکوع سے قومہ میں جاتے وقت یہ پڑھیں۔ سمع اللہ لمن حمدہ۔ مقتدی یہ کہیں ربنا ولک الحمد حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ (صلوۃ رسول ص ۲۲۲)

☆ دوسرا نظریہ کہ امام سمع اللہ لمن حمدہ اور ربنا لک الحمد دونوں کہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا امام کیلئے چونکہ تسمیع اور تحمید کا جمع کرنا نص حدیث سے ثابت ہے لہذا اسے جمع کرنا چاہئے۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۱۴، ۷ مئی ۱۹۹۳ء) اور نواب نور الحسن خان نے عرف الجادی ص ۳۷ میں اور نواب وحید الزمان صاحب نے نزل الابرار ص ۷۹، ج۱) میں لکھا ہے کہ امام دونوں کو جمع کرے۔

(احناف کے نزدیک امام سمع اللہ لمن حمدہ اور مقتدی ربنا لک الحمد کہے اور اگر امام دونوں کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے۔)

درمیان قعدہ میں درود شریف

غیر مقلدین حضرات میں سے شیخ البانی کا نظریہ یہ ہے کہ پہلے قعدہ میں بھی تشہد کے بعد درود شریف پڑھ سکتے ہیں۔ جبکہ دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ نہیں پڑھنا چاہئے۔ (تفصیل کیلئے دیکھیں فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۷۶، ج ۳)

قعدہ میں انگلی کس وقت اٹھائی جائے؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ جس وقت اشھد ان لا الہ الا اللہ پڑھیں اس وقت انگلی اٹھائیں۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا رفع سبابہ نماز میں سنت ہے۔ یعنی التحیات میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کے وقت انگشت شہادت یعنی کلمہ کی انگلی اٹھانا سنت ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۷۹، ج ۳) اور مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں اس طرح کہ جب کلمہ شہادت پر پہنچیں تو اپنے انگوٹھے کو درمیانی انگلی کے بیچ میں رکھ کر حلقہ بنا کر انگشت شہادت کو اشھد کہتے ہی اٹھائیں۔ (کہ زبان کے ساتھ انگلی بھی توحید کی شہادت دینے لگے) اور الا اللہ ختم کر کے گرا دیں۔ (صلوۃ رسول ص ۲۶۹)

☆ دوسرا نظریہ کہ قعدہ کے شروع سے ہی انگلی سے اشارہ کرتا رہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں صاحب المرعاۃ کے حوالہ سے لکھا گیا۔ یعنی ہمارے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ قعدہ کے شروع سے سلام پھیرنے تک مسلسل مسبحہ کے ساتھ اشارہ کرتا رہے۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۲۲۔ ۲۶ مئی ۱۹۹۵ء)

(احناف کے نزدیک اشھد کہتے وقت انگلی اٹھائے اور الا اللہ کہہ کر انگلی نیچے کر دے)

آخری قعدہ میں کس طرح بیٹھیں؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ آخری قعدہ میں ضرور تورک کرنا چاہئے۔ یعنی بایاں پاؤں دائیں طرف نکال کر بائیں کولھے پر بیٹھنا۔ چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں۔

نوٹ: بائیں جانب کولھے پر بیٹھنا تورک کہلاتا ہے یہ سنت ہے ہر مسلمان کو آخری قعدہ میں ضرور تورک کرنا چاہئے۔ (صلوۃ رسول ص ۲۷۴)

☆ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ پہلے قعدہ کی طرح دایاں پاؤں کھڑا کر کے بائیں پاؤں پر بیٹھنا بھی سنت ہے۔ چنانچہ نواب نور الحسن خان مرحوم لکھتے ہیں کہ قعدہ کی ہیئت یہ ہے کہ بائیں پاؤں پر بیٹھے اور دائیں پاؤں کو کھڑا کرے۔ اور بائیں پاؤں کو

آگے کر کے اور دائیں پاؤں کھڑا کر کے سرین پر بیٹھنا بھی روایت کیا گیا ہے۔ بہر حال جس طریقہ پر بھی بیٹھے خواہ تربع ہو یا تورک اور افتراش اس طریقہ پر بیٹھنا جائز ہے۔ اور آگے لکھتے ہیں کہ بیٹھنے کی جو حالتیں مروی ہیں ان میں کسی حالت پر بیٹھنے والا سنت کو ادا کرنے والا ہوگا۔ (عرف الجادی ص ۲۸)

(احناف کے نزدیک دونوں قعدوں میں غیر معذور مرد ایک ہی طرح بیٹھے۔ یعنی دایاں پاؤں کھڑا کرے اور بائیں کو بچھا کر اس پر بیٹھے)

فرض نماز کے بعد اجتماعی دعاء

باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد دعاء کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ یہ اجتماعی دعاء جائز بلکہ مستحب ہے۔ چنانچہ مولانا ابو سعید شرف الدین دہلوی صاحب مرحوم لکھتے ہیں خلاصہ یہ کہ بعد نماز فرائض ہاتھ اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے فعل اور قول دونوں سے ثابت ہے۔ اور دوام کی تلاش لغو ہے ورنہ مانع کو بھی اپنے طریق یعنی سلام پھیرتے ہی اٹھ بھاگنے کا پہلے ثبوت پھر دوام کا ثبوت دینا ہوگا۔ پھر آگے لکھتے ہیں۔ یہ فائدہ جماعت میں مل کر دعاء مانگنے کا ہے۔ خصوصاً بعد فرائض خصوصاً برفع یدین خصوصاً جماعت کے ساتھ مل کر دعا کرنے میں۔ (فتاوی ثنائیہ ص ۵۰۵، ج ۱) دوسرے مقام میں لکھا ہے ہاتھ اٹھا کر بعد نماز فرض کے دعا مانگنا درست ہے۔ (فتاوی ثنائیہ ص ۵۰۶، ج ۱ اور ص ۶۰۵، ج ۱ میں لکھا ہے بلکہ سنت ہے۔ اور ایک مقام میں لکھا ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بعد فرض کے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا درست ہے۔ (فتاوی نذیریہ ص ۵۶۴، ج ۱) اور ص ۵۶۵، ج ۱ میں لکھا ہے ان احادیث سے بعد نماز فرض کے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا قولاً و فعلاً آنحضرت ﷺ سے ثابت ہوا۔ اور آگے لکھا ہے حاصل ان حدیثوں کا یہ ہے کہ آپ نے فرمایا صبح کی نماز کے بعد یعنی فرض نماز کے بعد دعا مانگو اور جب دعا مانگو تو ہاتھ اٹھا کر دعا مانگو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگو۔ (حاشیہ فتاوی نذیریہ ص ۵۶۷، ج ۱)

اور ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ امام کی دعا میں شریک رہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ
ص ۵۷۳، ج ۱)

ایک سوال ہوا کہ فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ تو جواب
دیا گیا کہ نماز باجماعت کے بعد دعا کرنے کی جتنی احادیث وارد ہوئی ہیں وہ حسن
درجہ کو پہنچتی ہیں اسلئے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مستحب اور مستحسن ہے۔ اس کو لازمی نہیں سمجھنا
چاہئے۔ امام کو چاہئے کبھی دعا کرے کبھی نہ کرے تا کہ عملاً لوگوں کو تبلیغ ہو
جائے۔ (ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث لاہور ص ۶۔ ۴ فروری ۲۰۰۰ء)

اور ایک سوال کے جواب میں کہا گیا اور تعدد طرق کہ بنا پر بعد از نماز ہاتھ
اٹھا کر دعا مانگنے کی حدیث کو ہم نے حسن ثابت کیا ہے بلکہ بعض اسانید حسن لذاتہ ہیں
اسلئے ہاتھ اٹھانے میں کوئی خدشہ نہیں بلکہ استحباب ہے۔ ہاں لازمی سمجھنا بری بات اور
بدعت ہے۔ (تنظیم اہلحدیث ص ۶۔ ۳ جولائی ۱۹۹۸ء) اور شیخ الحدیث مولانا محمد
یونس دہلوی صاحب فرض نماز کے بعد دعا کا ثبوت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں
فرضوں کے سلام پھیرنے کے بعد امام اور مقتدی کا ہاتھ اٹھا کر ایک ساتھ دعا مانگنا
ضروری نہیں ہے۔ (دستور المتقی ص ۱۱۸) اور فرض نماز کے بعد دعاء کے جواز کا فتویٰ
فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۹۰، ج ۲، فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۱۴، ج ۳ و ص ۲۱۸، ج ۳ و
ص ۲۲۳، ج ۵ میں بھی دیا گیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا درست نہیں بلکہ بعض تو بدعت
کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا جہاں تک اجتماعی دعاء کا تعلق ہے
یہ رسول اللہ ﷺ سے قطعاً ثابت نہیں میں نے ایک سوال کے جواب میں اسی بات کی
نفی کی ہے اور شیخ ابن باز مفتی اعظم سعودی عرب نے/اپنے بعض فتووں میں اس کو
بدعت قرار دیا ہے۔ (ہفت روزہ الاعتصام لاہور ص ۹۔ یکم ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ)

ایک سوال کے جواب میں کہا گیا فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کرنا
رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ظاہر ہے عدم ثبوت کی بنا پر احداث فی الدین ہی قرار

پائے گا۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۱۰۔۱۲ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ) اسی طرح پنجگانہ نماز کے فرائض کے بعد اجتماعی دعا کے بارہ میں سوال ہوا تو جواب دیا گیا کہ ثابت نہیں انفرادی طور پر کرنا جائز ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۶۱)

مولانا ابوالبرکات احمد صاحب مرحوم لکھتے ہیں آہستہ آہستہ ہماری مسجدوں میں بھی اس کا رواج ہو گیا ہے اب ہماری مسجدوں میں بھی لوگ اعتراض کرنے لگ گئے ہیں۔ استاذ الاساتذہ شیخنا المکرّم محدث گوندلویؒ نے اپنی زیر نگرانی تین مساجد ٹاہلی والی مسجد، مسلم مسجد نوشہرہ روڈ، اور جامعہ اسلامیہ حافظ آباد روڈ میں اس بدعت کو ختم کرایا۔ اگر بالفرض کسی نے اس طرح دعا کی تو پوچھا یہ کہاں ہے؟ مجھے گوجرانوالہ آئے ہوئے اڑتیس سال ہو رہے اس وقت سے لے کر ان کی وفات تک کسی نماز کے بعد اجتماعی دعا کرتے ان کو نہیں دیکھا۔ (فتاوی برکاتیہ ص ۹۶)

(احناف کے نزدیک فرض نماز کے بعد دعاء درست ہے بشرطیکہ اس کو لازم نہ سمجھیں اگر کسی کو ضرورت ہو تو وہ اٹھ کر چلا جائے اس کو ملامت نہ کی جائے۔ اور اگر کبھی چھوڑ دی جائے تب بھی کوئی اعتراض وغیرہ نہ کرے۔)

ننگے سر نماز

غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ ننگے سر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا نیز ابھی گذرا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کپڑا فراخ ہونے کے وقت کندھے ڈھکنے کا حکم دیا ہے سر ڈھکنے کا حکم نہیں دیا اگر سر کا ڈھکنا ضروری ہوتا تو اس کا بھی کہیں حکم ہوتا ہاں افضل ہے۔ اور پھر حاشیہ میں لکھا ہے یہ یاد رہے کہ افضل کے مقابلہ میں جواز ہے اگر کوئی جواز پر عمل کرے تو اس پر طعن یا اعتراض نہیں ہو سکتا۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۶، ج ۲)

اسی طرح ایک سوال کے جواب میں کہا گیا لہٰذا ثابت ہوا کہ سر ننگے نماز جائز ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۵۹۲، ج ۱)

☆ دوسرا نظریہ کہ کپڑا ہوتے ہوئے ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ علامہ البانی نے ننگے سر نماز پڑھنے کو مکروہ کہا ہے۔ (الاعتصام ص ۱۱۔ ۱۲ ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ) اور علامہ البانی کے بارہ میں لکھا ہے کہ ذخیرہ احادیث کی تحقیق میں علامہ البانی کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ (الاعتصام ص ۸۔ ۲۸ ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ) اور غیر مقلدین کا یہ اعتراف بھی ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھنے والی ابن خزیمہ کی روایت کو البانی نے ضعیف کہا ہے۔ (الاعتصام ص ۷۔ ۲۸ اگست ۱۹۹۸ء)

نیز ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کپڑا موجود ہو تو سر ننگے نماز ادا کرنا یا ضد سے ہوگا یا قلت عقل سے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۸۸، ج ۴) آگے لکھا ہے ویسے یہ مسئلہ کتابوں سے زیادہ عقل و فراست سے متعلق ہے اگر اس جنس لطیف سے طبعیت محروم نہ ہو ننگے سر نماز ویسے ہی مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۸۹، ج ۴) پھر آگے لکھا ہے اگر فیشن کی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھی جائے تو نماز مکروہ ہوگی۔ اگر تعبد اور خضوع اور خشوع اور عاجزی کے خیال سے پڑھی جائے تو یہ نصاریٰ کے ساتھ تشبہ ہوگا۔ اسلام میں ننگے سر رہنا سوائے احرام کے تعبد یا خشوع و خضوع کی علامت نہیں اور اگر کسل اور سستی کی وجہ سے ہے تو یہ منافقوں کی ایک خلقت سے تشابہ ہوگا۔ ولا یاتون الا وھم کسالی (نماز کو آتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر) غرض ہر لحاظ سے یہ ناپسندیدہ عمل ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۹۱، ج ۴)

(احناف کے نزدیک کپڑا ہوتے ہوئے ننگے سر نماز ادب و احترام کے خلاف ہے۔)

وتر کی کتنی رکعات ہیں؟

غیر مقلدین حضرات اکثر یہ کہتے ہیں کہ تراویح تہجد اور وتر سب ایک ہی نماز کے نام ہیں۔ اور تراویح وتروں سمیت گیارہ کے قائل ہیں۔ جبکہ تہجد اور وتروں کی رکعات کے بارہ میں ان کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ ان کی رکعات گیارہ سے زیادہ بھی ہیں۔ چنانچہ ایک سوال ہوا

کہ نماز وتر صحیح حدیث سے کتنی رکعت ثابت ہیں؟ تو جواب دیا احادیث صحیحہ سے نماز وتر ایک رکعت و تین و پانچ و سات و نو و گیارہ و تیرہ رکعتیں ثابت ہیں۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۵۴۱، ج ۱) مولانا ابوالبرکات صاحب لکھتے ہیں تہجد آنحضرت ﷺ سے زیادہ سے زیادہ تیرہ رکعت ثابت ہیں۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۸۰)

اور ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ آپ نے کبھی بھی سنت فجر کے علاوہ بھی تیرہ رکعتیں پڑھی ہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۱۱، ج ۶)

مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی صاحب فرماتے ہیں زیادہ سے زیادہ آپ نے تہجد کی تیرہ رکعتیں پڑھی ہیں۔ (صلوۃ رسول ص ۳۶۷)

☆ دوسرا نظریہ کہ وتروں سمیت تہجد کی گیارہ ہی رکعات ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں کہا نماز تہجد آٹھ رکعت ہے وتر سمیت گیارہ۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۵۲۶، ج ۱) اور یہی جواب فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۵۴، ج ۴ میں دیا گیا ہے۔

اور ایک سوال ہوا کی نماز تہجد کتنی رکعت ہے؟ تو جواب دیا گیا تہجد۔ تراویح ایک ہی نماز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے آٹھ تراویح پڑھائی ہیں۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۹۰، ج ۲)

(احناف کے نزدیک وتر علیحدہ نماز ہے اور تراویح علیحدہ تہجد علیحدہ نماز ہے۔ وتر کی تین رکعات دو تشہدوں کے ساتھ پڑھنی افضل ہیں اور بیس رکعت تراویح سنت ہیں اور تہجد کی زیادہ سے زیادہ دس رکعات ہیں۔)

تراویح کہاں پڑھنا افضل ہے؟

بعض غیر مقلدین کے نزدیک تراویح مسجد کی بجائے گھر میں پڑھنا افضل ہے۔ چنانچہ تراویح کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے بمقابلہ مسجد کے گھر پڑھنا اور بمقابلہ اول رات کے اخیر رات میں پڑھنا افضل ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۸، ج ۶)

اس کے برخلاف دوسرے غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ تراویح اول رات مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا۔ اسلئے حسب ارشاد امام احمد بن حنبل" فضیلت اول رات باجماعت تراویح کو حاصل ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۵۶، ج ۶)

(احناف کے نزدیک تراویح باجماعت مسجد میں پڑھنی چاہئے۔ اور تہجد گھر میں پڑھنا افضل ہے۔)

کیا تراویح پڑھنے والا تہجد پڑھ سکتا ہے؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ عام دنوں میں جس کو تہجد کہتے ہیں رمضان المبارک میں وہی تراویح کہلاتی ہے اور دونوں پر وتر کا اطلاق ہے۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے لا وتران فی لیلة کہ ایک رات میں دو دفعہ وتر نہیں ہوتے۔ اس لئے تراویح پڑھ لینے والا تہجد نہیں پڑھ سکتا۔ چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم نے اسی نظریہ کو صلوۃ رسول ص ۲۸۰ میں بیان کیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ تراویح پڑھ لینے والا آخر شب میں تہجد پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ سوال ہوا جو شخص رمضان المبارک میں عشاء کے وقت نماز تراویح پڑھ لے وہ پھر آخر رات میں تہجد پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ تو جواب دیا گیا پڑھ سکتا ہے۔ تہجد کا وقت ہی صبح سے پہلے کا ہے۔ اول شب میں تہجد نہیں ہوتی۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۲۸۲، ج ۱)

(احناف کے نزدیک تراویح الگ اور تہجد الگ نماز ہے اسلئے جو دونوں پڑھنا چاہے پڑھ سکتا ہے۔)

مسبوق کی اقتداء جائز ہے یا نہیں؟

اگر امام کا وضوء ٹوٹ جائے اور اس نے نماز کے دوران ہی اپنا خلیفہ ایسے آدمی کو بنا دیا جس کی اپنی رکعت رہتی ہے یعنی امام کے ساتھ وہ پہلی رکعت میں شامل نہیں ہو سکا تو کیا اس مسبوق کے پیچھے باقی لوگوں کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ غیر

مقلدین کے اس بارہ میں دونظریے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ مسبوق کی اقتداء جائز ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں سوال ہوا تو جواب دیا گیا۔ امام شافعیؒ کے مذہب میں جائز ہے۔ بہت سے اہلحدیث بھی اس کے قائل ہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۵۷۰، ج۱) اسی طرح ایک سوال ہوا کہ مسبوق کے پیچھے نماز جائز ہے یا منع ہے؟ تو فتاویٰ نذیریہ کے حوالہ سے جواب دیا گیا کہ مسبوق کے پیچھے نماز پڑھنی حدیث سے مسکوت عنہ ہے اور اصل مسکوت عنہ میں جواز و اباحت ہے۔ پس جواز ثابت ہوگا۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۹۶، ج ۲)

(احناف کے نزدیک اگر اتفاقی طور پر مسبوق کی اقتداء کرنی پڑے تو اقتداء جائز ہے۔)

☆ دوسرا نظریہ کہ مسبوق کی اقتداء جائز نہیں۔ چنانچہ مولانا شرف الدین دہلوی صاحب لکھتے ہیں مسبوق کی اقتداء جائز نہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۵۷۰، ج۱) ایک سوال ہوا کہ مسبوق کی اقتدا میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ تو جواب دیا کہ مسبوق، کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا کسی حدیث میں ثبوت نہیں ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۲۶، ج ۲)

کیا امام قرأت بھول جائے تو سجدہ سہو کرے؟

غیر مقلدین کے اس بارہ میں دونظریے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ امام اگر قرأت میں کوئی آیت بھول جائے تو سجدہ سہو کرے۔ چنانچہ اسی بارہ میں سوال ہوا تو جواب دیا۔ حدیث شریف میں ہر بھول پر سجدہ کا حکم ہے۔ اسلئے قرأت بھول جائے تو بھی سجدہ سہو کرے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۵۳۷، ج۱)

یہی جواب فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۸۶، ج ۳ میں دیا گیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ قرأت بھولنے کی صورت میں سجدہ سہو نہیں۔ چنانچہ اسی قسم کا سوال ہوا تو جواب دیا۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ قرأت میں کسی آیت کے ترک ہونے سے یا بھول جانے سے نہ نماز لوٹانے کی ضرورت ہے نہ سجدہ سہو پڑتا

ہے۔(فتاویٰ اہلحدیث ص۲۸۲، ج۲) اسی طرح اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا شرف الدین دہلوی صاحب لکھتے ہیں۔ جو یہ جواب تحریر فرمایا گیا کہ حدیث شریف میں ہر بھول پر سجدہ کا حکم ہے اس لئے قرأت بھول جائے تو بھی سجدہ سہو کرے۔ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔(فتاویٰ ثنائیہ ص۵۳۸، ج۱)

(احناف کے نزدیک قرأت بھولنے کی وجہ سے سجدہ سہو نہیں آتا۔)

مدرک رکوع کی رکعت

اکثر غیر مقلدین حضرات تو یہی کہتے ہیں کہ اگر آدمی امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہو جائے تو اسکی وہ رکعت نہیں ہوتی مگر ان کا ایک طبقہ اس کا قائل ہے کہ رکعت ہو جاتی ہے اور وہ دلیل میں شیخ ابن باز کا فتوی پیش کرتے ہیں چنانچہ لکھا گیا شیخ عبدالعزیز بن باز نے ایک فتوی میں مدرک رکوع کی رکعت کو درست قرار دیا ہے۔

(ہفت روزہ الاعتصام ص۹۔ ۱۳ جون ۱۹۹۷ء)

(احناف کے نزدیک جو آدمی امام کے ساتھ رکوع میں مل جائے اس کی وہ رکعت ہو جاتی ہے۔ ہدایہ ص۱۵۳، ج۱)

جمعہ کے دن زوال کے وقت نماز

غیر مقلدین حضرات کے اس بارہ میں دو نظریئے ہیں۔ پہلا نظریہ کہ زوال کے وقت ہر قسم کی نماز پڑھنا منع ہے خواہ جمعہ کا دن ہو یا کوئی اور دن ہو۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے پس ثابت ہوا کہ زوال کے وقت نماز پڑھنی منع ہے خواہ یوم جمعہ ہو یا کوئی اور یوم۔ اس لئے کہ منع کی حدیثیں صحیح ہیں اور جواز کی صحیح نہیں۔(فتاوی ثنائیہ ص۵۴۴، ج۱) اور یہی بات فتاوی علمائے حدیث ص۱۶۲، ج۴ اور ص۱۳۳، ج۲ میں بھی کہی گئی ہے)

☆ دوسرا نظریہ کہ جمعہ کے دن زوال کے وقت نماز منع نہیں چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا زوال روز ہوتا ہے مگر زوال کے وقت جمعہ کے روز نفل وغیرہ پڑھنے جائز ہیں۔(فتاوی علمائے حدیث ص۱۶۲، ج۴) اور یہی جواب فتاوی ثنائیہ ص

۵۴۴، ج ۱ اور فتاوی علمائے حدیث ص ۱۳۳، ج ۲ میں بھی دیا گیا ہے۔
(احناف کے نزدیک زوال اور دیگر اوقات مکروھہ کے وقت نماز پڑھنا منع ہے خواہ جمعہ ہو یا کوئی اور دن ہو۔ ہدایہ ص ۸۵۔ ج ۱)

عشاء کی نماز کا وقت

غیر مقلدین حضرات کے اس بارہ میں دو نظریئے ہیں

☆ پہلا نظریہ۔ اکثر غیر مقلدین حضرات یہی کہتے ہیں کہ عشاء کی نماز کا وقت آدھی رات تک ہے، چنانچہ فتاوی اہلحدیث ص ۵۸، ج ۲ میں ہے۔ اور عشاء کا وقت سرخی غروب ہونے کے بعد آدھی رات تک ہے۔ اور مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی لکھتے ہیں وقت عشاء کا ہے ٹھیک آدھی رات تک (صلوۃ رسول ص ۱۴۳)

☆ دوسرا نظریہ ہے کہ آدھی رانت تک عشاء کی نماز کا وقت افضل ہے اور اس کے بعد فجر کے طلوع ہونے تک وقت باقی تو رہتا ہے مگر غیر افضل ہے چنانچہ علامہ وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں والعشاء منه الى نصف الليل وبعده الى طلوع الفجر غير مختار (کنز الحقائق ص ۱۷) عشاء کی نماز کا وقت آدھی رات تک ہے اور اس کے بعد فجر کے طلوع ہونے تک اس کا غیر مختار وقت ہے۔ اور اسی کے مطابق انہوں نے نزل الابرار ص ۵۶، ج ۱ میں لکھا ہے۔
(احناف کے نزدیک عشاء کی نماز کا وقت فجر کے طلوع ہونے تک ہے۔ ہدایہ ص ۸۲، ج ۱)

کتنی مسافت پر قصر نماز ہے

غیر مقلدین کے اس بارہ میں چار نظریات ہیں

☆ پہلا نظریہ کہ ایک میل سے زائد سفر کا ارادہ کرنے والا بھی مسافر ہے۔ نواب نور الحسن خان صاحب نے عرف الجادی ص ۴۰ میں یہی لکھا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ تین میل کی مسافت پر قصر کر لینی چاہیے۔ چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں پس مسافر کو اختیار ہے کہ وہ تین میل پر قصر

کرلے۔(صلوۃ رسول ص ۳۹۷)اور نورالحسن خان صاحب لکھتے ہیں کہ تین میل یا تین فرسخ اور اپنے شہر سے نکلنے سے لیکر واپس آنے تک دو رکعت آئی ہیں۔(عرف الجادی ص ۴۰)

☆ تیسرا نظریہ کہ کم از کم نو میل کی مسافت پر قصر ہے۔ چنانچہ شیخ الحدیث مولانا محمد یونس صاحب دہلوی لکھتے ہیں جس سفر میں نماز قصر کرنی پڑتی ہے اس کی حد مسافت صحیح حدیث سے صرف نو میل ثابت ہوتی ہے۔(دستور المتقی ص ۱۸۹) اور ایک سوال کے جواب میں کہا گیا سفر کی حد کم از کم نو کوس ہے۔ (تنظیم اہل حدیث ص ۵، ۱۸ ستمبر ۱۹۹۸ء) اور ایک سوال کے جواب میں کہا گیا ۹ میل کے سفر میں دوگانہ درست ہے۔(تنظیم اہل حدیث ص ۶، ۲۸ مئی ۱۹۹۹ء)

اور ایک جگہ لکھا ہے اور ہمارے اہل حدیث کے نزدیک نماز قصر نو میل پر ہے۔(محمدی نماز ص ۱۸۲)اور ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ نو میل کے سفر میں دوگانہ درست ہیں۔(فتاوی اہلحدیث ص ۲۴۵، ج ۲)

☆ چوتھا نظریہ کہ اڑتالیس میل کی مسافت پر قصر نماز ہے چنانچہ مولانا ابو سعید شرف الدین دہلوی صاحب لکھتے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ مسافت قصر ۴۸ میل ہی صحیح ہے نو میل غلط ہے۔(فتاوی ثنائیہ ص ۴۶۲، ج ۱)اور ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ درمیانہ چال سے اگر سفر تین روز کا ہو جائے تو اس پر قصر کرنا جائز ہے۔ خواہ گاڑی سے ایک ہی دن میں طے کرلے۔(فتاوی نذیریہ ص ۵۵۹، ج ۱)

(احناف کے نزدیک قصر نماز اور روزہ چھوڑنے کیلئے اڑتالیس میل شرعی جو کہ انگریزی ۵۴ میل اور موجودہ حساب سے ۸۷ کلومیٹر بنتے ہیں۔ خیر الفتاوی ص ۶۷۵، ج ۲)

مسافر کتنے دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو قصر کرسکتا ہے؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے تین نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ اگر کسی جگہ انیس دن ٹھہرنے کی نیت کرے تو مسافر قصر کرے اور اگر اس سے زیادہ کی نیت ہو تو پوری نماز پڑھے۔ چنانچہ مولانا محمد یونس صاحب

دہلوی لکھتے ہیں کسی مقام پر اگر ۱۹ روز قیام کرنے کی نیت کی ہے تو نماز قصر پڑھے
اگر ۱۹ روز سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کی ہے تو قصر نہ کرے۔ (دستور المتقی ص ۱۸۹)
اسی طرح مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی لکھتے ہیں اور اگر انیس دن تک ٹھہرنے کا
قصد ہو تو بھی نماز میں قصر ہی کرے۔ (صلوۃ رسول ص ۳۹۹)

☆ دوسرا نظریہ کہ چار دن سے زیادہ دن ٹھہرنے کی نیت ہو تو قصر نہ کرے بلکہ
پوری نماز پڑھے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا اگر سفر میں کسی جگہ چار دن
سے زیادہ قیام کی نیت کرے تو وہاں پہنچ کر نماز پوری پڑھے۔ اگر چار دن یا چار دن
سے کم قیام کی نیت ہو تو پھر دوگانہ پڑھے۔ (تنظیم اہل حدیث ص ۵، ۱۸ ستمبر ۱۹۹۸ء)
اور نواب نور الحسن صاحب لکھتے ہیں و در اقامت چار روز اتمام نماز لازم (عرف الجادی
ص ۴۰) چار دن اقامت کی نیت ہو تو پوری نماز لازم ہے۔ اور ایک سوال کے جواب
میں کہا گیا اس لئے تین چار روز سے زیادہ قصر نہ کرنی چاہئے اور یہی اہل حدیث کا
مذہب ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۴۹، ج ۲)

☆ تیسرا نظریہ کہ بیس دن سے زائد کی نیت ہو تو قصر نہ کرے چنانچہ علامہ نواب
وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں و من نوی الاقامۃ اکثر من عشرین اتم۔ (نزل الابرار ص
۱۴۸، ج ۱) جس نے بیس دن سے زائد ٹھہرنے کی نیت کی وہ نماز پوری پڑھے۔
(احناف کے نزدیک اگر پندرہ دن یا اس سے زائد ٹھہرنے کی نیت کی تو پوری نماز
پڑھے۔ ہدایہ ص ۱۶۶، ج ۱)

اگر مسافر ٹھہرنے میں متردد ہو تو کیا کرے؟

اگر مسافر کسی جگہ جا کر ٹھہرا اور نیت نہیں کی کہ کتنے دن ٹھہرنا ہے بلکہ اس کی
نیت یہی ہے کہ آج کل چلے جانا ہے تو وہ کیا کرے اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے
دو نظریے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ مسافر تردد کی حالت میں بیس دن تک قصر کر سکتا ہے۔ چنانچہ
نواب نور الحسن صاحب لکھتے ہیں و در تردد تا بست روز قصر ثابت شدہ (عرف الجادی

ص ۴۰ اور تردد کی صورت میں بیس دن تک قصر ثابت ہے۔ اور علامہ نواب وح
الزمان صاحب لکھتے ہیں فان کان متردداً یقصر الی عشرین یوما (ک
الحقائق ص ۳۴، اور اسی کے مطابق انہوں نے نزل الابرار ص ۱۴۸، ج ۱ میں لکھا۔
اور پھر قیل کے ساتھ دوسرے اقوال بھی لکھے ہیں۔

☆ دوسرا نظریہ کہ متردد آدمی جتنا بھی ٹھہرا رہے وہ قصر ہی کرے چنانچہ مولانا م
صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں اگر کوئی مسافر کسی شہر میں متردد ٹھہرے کہ آ
جاؤں گا یا کل جاؤں گا تو نماز قصر کرتا رہے خواہ کئی مہینے لگ جائیں۔ (صلوۃ رسو
ص ۳۹۸) اسی طرح مولانا محمد یونس صاحب دہلوی فرماتے ہیں ہاں اگر قیام میر
شک ہو اور آج کل کوچ کرنے کی نیت ہو تو اس تردد کی حالت میں نماز قصر کی جائے گ
گو بہت دن لگ جائیں۔ (دستور المتقی ص ۱۹۰)

(احناف کے نزدیک تردد کی حالت والا قصر ہی کرتا رہے خواہ کتنا ہی عرصہ ٹھہرا رہے۔
ہدایہ ص ۱۶۶، ج ۱)

<u>ہمیشہ سفر میں رہنے والا کیا کرے؟</u>

اگر ایک آدمی جو ملازمت کی وجہ سے اکثر سفر میں رہتا ہے جیسا کہ ڈرائیو
وغیرہ تو یہ کیا کرے؟ نماز قصر سے پڑھے یا پوری پڑھے۔ اس بارہ میں غیر مقلدین
کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ وہ قصر نہیں کرسکتا ہے۔ چنانچہ ایک سوال ہوا موٹر گاڑی کا
ڈرائیور جو اکثر سفر میں رہتا ہے اور بطور پیشہ یا ملازم مسافر کہلاتا ہے کیا نماز قصر کرسکتا
ہے؟ تو جواب دیا گیا وہ نماز قصر نہیں کرسکتا۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۱۰، ج ۴)

☆ دوسرا نظریہ کہ وہ قصر کرسکتا ہے۔ چنانچہ سوال ہوا جو لوگ ہمیشہ سفر میں رہتے
ہیں جیسے جہاز کے سارنگ یا خلاصی وغیرہ ان کو نماز قصر پڑھنی چاہئے یا پوری؟ تو
جواب دیا گیا جو لوگ ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں جیسے جہاز کے خلاصی وغیرہ وہ شرعاً مقیم
نہیں بلکہ مسافر ہیں۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۵۵۶، ج ۱) اور یہی جواب فتاویٰ علمائے

حدیث میں بھی دیا گیا ہے۔ جس میں یہ الفاظ بھی ہیں پس ثابت ہو گیا کہ دائم السفر کو بھی قصر کرنا چاہیے۔ (ص ۲۱۲، ج ۴)

اور ایک عورت نے سوال پوچھا کہ میرا شوہر ملازمت کیلئے روزانہ آنے جانے کا دو سو کلومیٹر سفر کرتا ہے۔ جب کہ اس دوران ظہر کی نماز آتی ہے۔ تو کیا وہ نماز قصر کرے تو جواب دیا گیا آپ کے شوہر سفر کے دوران نماز ظہر قصر کر سکتے ہیں۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۱۳، ۶ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ)

مولانا ابوالبرکات احمد مرحوم سے سوال ہوا کیا گاڑی کا ڈرائیور ساری عمر نماز قصر ہی کریگا یا پوری پڑے گا؟ تو جواب دیا جب تک وہ اپنے شہر سے باہر ہے وہ مسافر ہی ہے۔ اور وہ قصر کر سکتا ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۳۹)

(احناف کے نزدیک ایسے حضرات جب تک سفر میں رہیں گے نماز قصر ہی پڑھیں گے۔ احسن الفتاویٰ ص ۸۷، ج ۴)

ملازمت وغیرہ کی وجہ سے نماز کو وقت سے پہلے ادا کرنا

اگر ایک آدمی ملازم ہے اور ملازمت کے دوران اس کو عصر کی نماز کا وقت نہیں ملتا تو کیا وہ عصر کی نماز ظہر کی نماز کے ساتھ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆☆ پہلا نظریہ کہ عصر کی نماز ظہر کے ساتھ پڑھ سکتا ہے چنانچہ سوال ہوا کہ مجھے نوکری کے باعث ظہر کے وقت ہمیشہ فرصت رہتی ہے عصر میں فرصت نہیں ملتی کیا ظہر کے وقت عصر ملا کر پڑھنے کی اجازت ہے تو جواب دیا گیا واقعی اگر وقت عصر نہیں ملتا ظہر کے ساتھ جمع کر لیا کریں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۲۵، ج ۴) اور یہی جواب فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۳۶، ج ۱ اور ص ۶۱۵، ج ۱ میں دیا گیا ہے۔ اور ایک سوال ہوا کہ مسلم حصول انعام کیلئے مثلاً آپ فٹبال کھیلا کرتے ہیں اور کھیلنے کے باعث عصر و مغرب کی نماز ترک کر دیتے ہیں پر قضا نماز پڑھ لیتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟ تو جواب دیا گیا نماز قضا کر کے پڑھنا بلا وجہ اچھا نہیں ہے۔ کھیلنے والوں کو چاہیے کہ پہلے افسروں

سے تصفیہ کرلیں کہ نماز کے وقت کھیل کود چھوڑ دیں گے وہ اگر نہ مانیں تو ظہر کے سا
عصر ملالیں یا عصر کے ساتھ ظہر ملا کر جمع پڑھ لیں۔ (فتاوی ثنائیہ ص ۶۳۲، ج ۱)

☆ دوسرا نظریہ کہ نماز کو ایسی حالت میں مقدم کرنا جائز نہیں ہے۔

چنانچہ مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی صاحب لکھتے ہیں خلاصہ یہ کہ ا
صورت میں اگر جمع صوری تاخیر مل سکے تو فبہا ورنہ ملازمت ترک کرنی لازم ہے ا
لئے کہ جس ملازمت سے فریضہ الہیہ کی ترک لازم ہو وہ ملازمت واجب الترک ہے
(فتاوی ثنائیہ ص ۶۱۶، ج ۱ و فتاوی علمائے حدیث ص ۲۲۶، ج ۱)

(اس بارہ میں احناف کا نظریہ یہ ہے کہ عرفہ کے دن عرفات میں عصر کی نماز کو مقدم
جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی نماز کو اس کے وقت سے مقدم کرنا جائز نہیں ہے۔ مجبور
کی صورت میں قضاء پڑھی جا سکتی ہے۔ (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو خیر الفتاوی ص
۱۹۲، ج ۲))

عصر کے بعد دو رکعت

روایات سے ثابت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے عصر کے بعد دو رکعت ا
کیں۔ کیا یہ دو رکعتیں امتی بھی پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدی
کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ یہ ہے کہ امتیوں کو بھی یہ دو رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔ چنانچہ غیر
مقلدین کے شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمنان صاحب نور پوری نے اپنے مرکز
جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ میں رکعات نماز پر ایک مقالہ پڑھا جس میں انہوں نے اس
بات پر ترغیب دی کہ عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنی چاہئیں اور جو حضرات یہ کہتے ہیں
کہ یہ دو رکعت حضور علیہ السلام کے ساتھ خاص تھیں ان کا نظریہ درست نہیں ہے۔ اس
مقالہ کی کیسٹ امجد کیسٹ ہاؤس مغل مارکیٹ گوجرانوالہ سے مل سکتی ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ عصر کے بعد سورج غروب ہونے تک نفل نماز پڑھنا منع ہے
چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ ایک آدمی نے حضرت عمرؓ سے تین سوالات

کئے تھے۔ ان میں سے ایک سوال عصر کے بعد کی دو رکعتوں کے بارہ میں تھا۔ دوسرا سوال عصر کے بعد دو رکعت سے۔ کہا مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۳۳۴، ج۱)

ایک سوال ہوا وہ کون سے اوقات ہیں جن میں نماز پڑھنی مکروہ ہے؟ تو جواب میں یہ بھی کہا کہ نماز عصر کے بعد آفتاب کے غروب ہونے تک سب جگہ نماز منع ہے ہاں مکہ میں ہر وقت درست ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۵۹، ج ۲) مولانا محمد یونس صاحب دہلوی لکھتے ہیں عصر کے فرضوں کے بعد سورج چھپنے تک کوئی نماز بھی درست نہیں لیکن ہاں اسی دن کی فرض نماز قضاء پڑھنا جائز ہے۔ (دستور المتقی ص ۱۰۷)

(احناف کے نزدیک عصر کی نماز کے بعد نوافل پڑھنا درست نہیں۔ (ہدایہ ص ۸۵، ج۱) ہاں قضاء نماز پڑھی جاسکتی ہے۔)

فجر کے وقت تحیۃ المسجد پڑھنا

کیا فجر طلوع ہو جانے کے بعد تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے یا نہیں اس کے متعلق غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ اس وقت میں تحیۃ المسجد نہیں پڑھ سکتا۔ چنانچہ ایک سوال ہوا صبح کے وقت تحیۃ المسجد پڑھے یا نہ؟ تو جواب دیا اور اس کے آخر میں کہا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ پو پھٹنے کے بعد تحیۃ المسجد درست نہیں جیسے طلوع آفتاب کے وقت نماز درست نہیں۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۷۷، ج ۲) اور یہی جواب ص ۳۳۴، ج۱ میں دیا گیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ فجر کے وقت تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا فجر کی سنت گھر ادا کرے اور مسجد میں آکر تحیۃ المسجد پڑھے۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۶۔ ۷ اگست ۱۹۹۸ء)

اور ایک سوال کے جواب میں کہا گیا جو گھر میں صبح کی سنتیں پڑھ کر آئے وہ

تحیۃ المسجد پڑھے۔اور جو نہ پڑھ کر آئے وہ سنتیں پڑھے۔(ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث ص۶۔ ۴ ستمبر ۱۹۹۹ء)

(احناف کے نزدیک فجر طلوع ہو جانے کے بعد سے طلوع آفتاب تک فجر کی سنتوں کے علاوہ کوئی نفل نہیں پڑھے جا سکتے۔(ہدایہ ص ۸۶، ج۱) اور فجر کی سنتیں بھی نماز سے پہلے پڑھے اگر رہ جائیں تو سورج نکلنے کے بعد پڑھے۔(خیر الفتاوی ص۴۹۵، ج۲)

ظہر کی نیت سے عصر کی جماعت میں شریک ہونا

امام عصر کی نماز پڑھا رہا ہو اور مقتدی کی ظہر کی نماز رہتی ہو تو کیا مقتدی ظہر کی نیت کر کے اس امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے جو عصر پڑھا رہا ہے؟ تو اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ ظہر کی نیت سے عصر پڑھانے والے کے پیچھے نماز درست نہیں چنانچہ ایک سوال ہوا کہ ایک شخص کی نماز ظہر قضاء ہوگئی اور وہ ایسے وقت پر مسجد میں آیا جبکہ نماز عصر کی جماعت قائم ہو گئی تھی آیا وہ ظہر کی نیت سے جماعت میں شامل ہو جائے یا علیحدہ ظہر پڑھے؟ تو جواب دیا گیا اس کو چاہئے کہ عصر کی نماز جماعت میں شامل ہو کر ادا کرے ظہر کی نیت سے نماز عصر میں ہرگز شامل نہ ہووے۔(فتاوی علمائے حدیث ص ۱۲۷، ج۲)

☆ دوسرا نظریہ کہ ظہر کی نیت سے عصر کی نماز میں شامل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک سوال ہوا اگر کسی کی ظہر قضاء ہو جائے تو عصر کی نماز میں ظہر کی نیت کرے یا عصر کی؟ تو جواب دیا اگر امام عصر پڑھا رہا ہو تو اس پیچھے ظہر کی نیت بھی کر سکتا ہے اور عصر کی بھی۔ اگر ظہر کی نیت کرے تو عصر بعد میں پڑھے۔(فتاوی اہلحدیث ص ۶۱، ج۲)

(احناف کے نزدیک امام اور مقتدی کی ایک ہی نماز فرض ہو تو اقتداء درست ہوگی ورنہ نہیں یعنی جو نماز امام پڑھ رہا ہے وہی مقتدی پڑھے۔(ہدایہ ص ۱۲۷، ج۱) البتہ ظہر اور عشاء کی نماز اگر اکیلے پڑھ چکا ہو تو نفل کی نیت سے امام کے ساتھ شامل ہو

جائے)

مرد وعورت کی نماز میں فرق

عورت رکوع سجدہ اور قعدہ وغیرہ مرد کی طرح کرے یا اسکی نماز میں کچھ فرق ہے؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ عورت کی نماز میں کچھ فرق ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے لیکن عورت کے متعلق بعض حدیثوں میں استثناء آتی ہے کہ عورت پیٹھ نہ اٹھائے بلکہ رانوں سے ملا لے اگر چہ ان احادیث میں کچھ کلام ہے لیکن ان کے مویدات بھی ہیں اس لئے ان پر عمل ہو سکتا ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۸۳، ج ۲)

اور ایک سوال ہوا کہ عورتوں کو نماز میں انضمام کرنا چاہئے یا نہ۔ تو جواب میں جواز ثابت کر کے آخر میں کہا غرض کے عورتوں کا انضمام وانخفاض نماز میں احادیث و تعامل جمہور اہل علم از مذاہب اربعہ وغیرہم سے ثابت ہے اس کا منکر کتب حدیث و تعامل اہل علم سے بے خبر ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۴۹، ج ۳) انضمام اور انخفاض کا مطلب یہ ہے کہ جسم کے اعضاء کو ایک دوسرے سے ملا کر رکھے اور سجدہ پست کرے مردوں کی طرح پیٹھ اٹھا کر نہ کرے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح ہی نماز پڑھیں چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی لکھتے ہیں یاد رکھیں کہ تکبیر تحریمہ سے شروع کر کے السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک عورتوں اور مردوں کیلئے ایک ہیئت اور شکل کی نماز ہے۔ (صلوۃ رسول ص ۱۹۱) اور ایک سوال لکھے جواب میں کہا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح بیٹھیں اور جو حدیثیں بیہقی اور ابوداؤد کی مذکور فی السوال ہیں وہ ضعیف ہیں قابل حجت نہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۷۵، ج ۳) اور مولانا محمد یونس دہلوی لکھتے ہیں شریعت محمدی میں مرد وعورت کی نماز میں کوئی فرق نہیں بلکہ جس طرح مرد نماز پڑھتا ہے اس طرح عورت کو بھی پڑھنا چاہئے۔ (دستور المتقی ص ۱۵۱)

(احناف کے نزدیک عورت سینہ پر ہاتھ باندھے اور سجدہ پست کرے اور جسم کے

اعضاء کے ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھے تا کہ زیادہ سے زیادہ ستر ہو جائے)

صلوۃ تسبیح

آج کل غیر مقلدین حضرات بڑے زور و شور کے ساتھ عورتوں کیلئے صلوۃ تسبیح کا اہتمام کرواتے ہیں۔ کیا یہ نماز صحیح احادیث سے ثابت ہے؟ اس کے بارہ میں ان کے دو نظریے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ یہ نماز صحیح احادیث سے ثابت نہیں۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں مولانا ابوالبرکات احمد صاحب لکھتے ہیں جس پر محدث گوندلویؒ کی تصدیق بھی ہے۔ اب رہ گئی نماز تسبیح اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ صحیح احادیث سے ثابت ہی نہیں۔ اکثر علماء نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۷۷)

☆ دوسرا نظریہ کہ یہ نماز پڑھنی چاہئے چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی لکھتے ہیں حضور انور ﷺ نے اپنی امت کو یہ نماز ایک بیش بہا خزانہ عطا فرمایا۔ (صلوۃ رسول ص ۴۲۴) اسی طرح اسکی ترغیب دستور المتقی ص ۱۹۲ وغیرہ کتابوں میں دی گئی ہے۔ اور ایک مقام میں لکھا ہے کہ صلوۃ تسبیح والی حدیث پر عمل ہو سکتا ہے اور آخر میں لکھا ہے اس سے ثابت ہوا کہ نماز تسبیح میں جماعت کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۵۷، ج ۴)

(احناف کے نزدیک صلوۃ تسبیح پڑھنی چاہئے مگر اس کی جماعت درست نہیں۔ (خیر الفتاویٰ ص ۴۸۳، ج ۲))

عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہو جائیں تو کیا کرے؟

اگر عید اور جمعہ ایک ہی دن جمع ہو جائیں تو جمعہ کے بارہ میں غیر مقلدین کے تین نظریات ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ عید پڑھی جائے اور اس دن جمعہ اور ظہر کی نماز دونوں معاف ہیں۔ غیر مقلدین کے کئی ائمہ مساجد ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور اسی طرح کا ایک سوال بھیجا گیا کہ ہمارے خطیب صاحب جو اہلحدیث ہیں انہوں نے کہا ہے کہ عید پڑھ لی

جائے اور جمعہ اور ظہر دونوں معاف ہیں۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ص ۷، ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ)

☆ دوسرا نظریہ کہ عید کی نماز پڑھی جائے پھر آدمی کو اختیار ہے خواہ جمعہ پڑھے یا ظہر کی نماز پڑھ لے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا پس عید اور جمعہ ایک دن اکٹھے آجائیں تو ایسی صورت میں جمعہ کی رخصت ہے پڑھے یا نہ۔ لیکن اگر جمعہ نہ پڑھے تو ظہر ضرور پڑھنی چاہئے۔ بہتر جمعہ پڑھنا ہے۔ (فتاوٰی اہلحدیث ص ۴۰۷، ج ۲) ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جمعہ اور عید اکٹھی آجائیں تو ظہر پڑھنی ہوگی۔ (الاعتصام ص ۷، ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ) اور مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی لکھتے ہیں جمعہ کے روز اگر عید آجائے تو عید کی نماز پڑھ لی جائے اور پھر جمعہ پڑھیں یا ظہر۔ (صلوۃ رسول ص ۳۸۹)

☆ تیسرا نظریہ کہ عید کی نماز بھی پڑھی جائے اور جمعہ بھی پڑھنا ضروری ہے چنانچہ غیر مقلد عالم مولانا عنایت اللہ اثری صاحب نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے القول السدید فی وجوب الجمعۃ وان وافقہا یوم العید۔ یعنی جمعہ کے دن اگر عید آجائے تب بھی جمعہ پڑھنا ضروری ہے اور یہی درست بات ہے۔

(احناف کے نزدیک عید کی نماز سنت مؤکدہ اور جمعہ فرض ہے اسلئے جمعہ کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ (ہدایہ ص ۱۷۲، ج ۱)

مسجد کا محراب

غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ مساجد میں محراب بنانا درست نہیں ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالجبار غزنوی مرحوم اپنے فتاوٰی میں لکھتے ہیں محراب حکم مسجد ندارد و قیام دراں مکروہ است۔ یعنی محراب کو مسجد کا حکم نہیں ہے اور اس میں کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ (بحوالہ فتاوٰی اہلحدیث ص ۳۰۹، ج ۱) اور اسی فتوی کے حوالہ سے فتاوٰی علمائے حدیث ص ۸۰۔۸۱،

ج۲ میں جواب دیا گیا ہے۔ اور غیر مقلد عالم مولانا عبدالقادر حصاروی لکھتے ہیں خلاصہ کلام یہ ہے کہ حدیث اور اقوال صحابہ اور تابعین کے فرمان اور علماء محققین کے بیان سے یہ مسئلہ سورج کی طرح روشن ہے کہ محراب مسجد میں بنانا بدعت ہے۔ اور قیامت کی نشانی ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص۳۱۳، ج۱) اور ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ میرے نزدیک ورع واحتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مسجدوں میں محراب بنانے سے اجتناب کیا جائے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص۸۲، ج۲)

☆ دوسرا نظریہ کہ مسجد میں محراب بنانا درست ہے۔ چنانچہ لکھا گیا کہ محراب مسجد میں بنانا درست ہے بدعت نہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص۸۳، ج۲) اور دوسرے مقام پر لکھا ہے بیشک محراب بنانا مسجدوں میں جائز ہے۔ اس کے عدم جواز پر کوئی دلیل نہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص۸۴، ج۲)

(احناف کے نزدیک مساجد میں محراب بنانا جائز ہے۔ (فتاویٰ محمودیہ ص۱۶۳، ج۶)

کافر اور مشرک کے پیسے سے مسجد بنانا

کیا مسجد بنانے میں یا اسکی مرمت میں کافر کا پیسہ خرچ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ کافر اور مشرک کا پیسہ مسجد میں لگانا درست نہیں ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کافر اور مشرک کے روپیہ سے مسجد بنانا ناجائز ہے ان کا روپیہ مسجد میں نہیں لگ سکتا۔ جب اس پر کسی نے اعتراض کیا تو جواب دیا کہ **انما یعمر مساجد الله** والی آیت سے ہمارا مدعا ثابت ہے کہ کسی کافر کا روپیہ مسجد میں نہیں لگایا جا سکتا۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص۳۷، ج۲)

☆ دوسرا نظریہ کہ کافر کا پیسہ مسجد میں لگ سکتا ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا اگر غیر مسلم حلال اور پاکیزہ کمائی سے مسجد کی تعمیر میں امداد کرے تو اس کے حلال پیسے کا مسجد میں لگانا درست ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص۳۸، ج۲) اور ایک مقام میں لکھا ہے اور اب بھی کوئی غیر مسلم تعمیر مسجد کو ثواب اور پن کا کام سمجھ کر

حلال کمائی سے امداد کرنا چاہے تو اس کا قبول کرنا جائز ہوگا۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۴۵، ج ۲) اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار کا مال مسجد پر صرف ہو سکتا ہے۔ وہ چاہے پلاٹ کی شکل میں یا روپیہ کی شکل میں ہو بشرطیکہ وہ حلال کمائی کا ہو۔ (ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث ص ۸، ۲۳ جون ۲۰۰۰ء)

(احناف کے نزدیک اگر کافر مسلمانوں پر احسان کر کے اپنا کوئی مفاد نہیں چاہتا یا فتنہ بپا نہیں کرنا چاہتا تو ایسی حالت میں اس کا پیسہ مسجد میں لگانا درست ہے۔ فتاویٰ محمودیہ ص ۴۷۶، ج ۲)

کس مسجد میں اعتکاف بیٹھے؟

رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں مسلمان مساجد میں اعتکاف بیٹھتے ہیں تو اعتکاف کونسی مسجد میں بیٹھنا چاہیے؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ اعتکاف اسی مسجد میں بیٹھے جہاں جمعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا ابو سعید شرف الدین دہلوی صاحب لکھتے ہیں یہ صحیح ہے مگر نماز جمعہ فرض ہے اور اعتکاف سنت ہے اگر جمعہ ترک کرے تو ممنوع ہے اور نکلنے کا ثبوت نہیں ملتا۔ لہذا جہاں جمعہ ہو وہیں اعتکاف لازم ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۸۳، ج ۱) اور یہی بات فتاویٰ علمائے حدیث ص ۴۵۹، ج ۶ میں لکھی گئی ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ ہر مسجد میں اعتکاف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا۔ جمہور علماء کے نزدیک اعتکاف ہر مسجد میں جائز ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۴۵۹، ج ۶ اور یہی جواب فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۸۳، ج ۱ میں دیا گیا ہے)

(احناف کے نزدیک ہر ایسی مسجد جس میں پنجگانہ نماز باجماعت ہوتی ہے وہاں اعتکاف درست ہے۔ اور جمعہ کیلئے جامع مسجد میں جا سکتا ہے۔ مگر وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ ہدایہ ص ۲۳۰، ج ۱)

اعتکاف کب بیٹھے؟

غیر مقلدین کے اس بارہ میں تین نظریات ہیں

☆ پہلا نظریہ کہ اعتکاف بیٹھنے والا رمضان کی بیسویں تاریخ کی صبح کو بیٹھے۔ چنانچہ مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی صاحب لکھتے ہیں، حدیث صحیح میں نماز صبح کے بعد ہے کان النبی ﷺ اذا اراد ان یعتکف صلی الفجر ثم دخل معتکفہ متفق علیہ کذا فی بلوغ المرام۔ یہ ہوگا کہ بیسویں کی صبح کی نماز کے بعد اعتکاف میں بیٹھ جائے تاویل لغو ہے۔ (فتاوی ثنائیہ ص ۶۴۹، ج ۱) اور یہی عبارت فتاوی علمائے حدیث ص ۴۵۵، ج ۶ میں بھی لکھی گئی ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ اکیسویں رات کی مغرب کے وقت اعتکاف بیٹھ جانا چاہئے۔ چنانچہ اعتکاف کا بیان کا عنوان قائم کر کے لکھا گیا کہ اکیسویں رات کو مغرب کے وقت سے مسجد میں آ جائے۔ (فتاوی علمائے حدیث ص ۳۹، ج ۶)

اور ایک سوال ہوا کہ زید بیسویں رمضان کو صبح کی نماز پڑھ کر اعتکاف بیٹھ گیا آیا اس کا یہ فعل سنت کے مطابق ہے؟ تو جواب دیا گیا اکیسویں شب مغرب کے بعد اعتکاف بیٹھ جانا چاہئے یہی سنت ہے۔ (فتاوی ثنائیہ ص ۶۵۶، ج ۱) اور یہی جواب فتاوی علمائے حدیث ص ۴۵۴، ج ۶ اور ص ۴۵۸، ج ۶ میں بھی دیا گیا ہے۔

☆ تیسرا نظریہ کہ اعتکاف بیٹھنے والے کو اختیار ہے خواہ بیسویں کی شب کو بیٹھے یا اکیسویں کی صبح کو بیٹھے۔ چنانچہ غیر مقلد عالم لکھتے ہیں۔ اعتکاف کی نیت کرنے والے بیسویں روزہ کی شام کو یا اکیسویں روزہ کو صبح کی نماز پڑھ کر اعتکاف میں بیٹھ جائیں۔ (محمدی نماز ص ۳۲۱)

(احناف کے نزدیک نفل اعتکاف جب چاہے بیٹھ جائے اور مسنون اعتکاف کیلئے اعتکاف بیٹھنے والے کو بیسویں روزہ کی نماز مغرب اس مسجد میں ادا کرنی چاہئے جہاں اس نے اعتکاف بیٹھنا ہے۔ احناف کے نزدیک بیسویں تاریخ کا دن چھپنے سے پہلے اعتکاف بیٹھے۔ بہشتی زیور ص ۲۱، تیسرا حصہ)

لیلۃ القدر کونسی رات ہے؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ ستائیسویں رات لیلۃ القدر ہے۔ چنانچہ یوں عنوان قائم کیا گیا ۔لیلۃ القدر ۲۷ رمضان کو ہوتی ہے۔ اور آگے ایک رویت نقل کی کہ لیلۃ القدر ۲۷ رمضان کو ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۶۷، ج ۶) اور ایک سوال ہوا کہ ستائیسوں شب کو شیرینی کا انتظام کیا جاتا ہے کیا یہ درست ہے؟ تو جواب دیا بہ نیت ولیمۃ القرآن جائز ہے محض فخر و ریا کیلئے جائز نہیں۔ (فتاوی ثنائیہ ص ۶۸۴، ج ۱، فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۷۰، ج ۶)

☆ دوسرا نظریہ کہ یہ رات رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں بدل بدل کر آتی ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا بعض احادیث میں ایسے نشان آئے ہیں جن سے ستائیسویں رات کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے رواج ہو گیا مگر اصح یہی ہے کہ سب طاق راتوں میں تلاش چاہیے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۶۹، ج ۶) اور مولانا محمد یونس صاحب دہلوی لکھتے ہیں۔ اکثر یہ مبارک رات رمضان کی اکیسویں یا تیئیسویں یا پچیسویں یا ستائیسویں یا انتیسویں تاریخ کی راتوں میں پھرتی ہوئی ہر سال ہوا کرتی ہے۔ (دستور المتقی ص ۲۱۲)

(احناف کے نزدیک لیلۃ القدر رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرنی چاہیے۔ تفسیر معارف القرآن ص ۷۹۲، ج ۸)

رمضان المبارک میں ایک وتر

کیا رمضان المبارک میں ایک وتر پڑھ سکتے ہیں؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ رمضان المبارک میں ایک وتر نہیں پڑھ سکتے چنانچہ سوال ہوا کہ کیا رمضان میں ایک وتر پڑھایا جا سکتا ہے؟ تو جواب دیا کہ آنحضرت ﷺ نے گیارہ رکعتیں (آٹھ تراویح اور تین وتر ہی پڑھی ہیں۔ آٹھ رکعت اور ایک وتر رمضان شریف میں نبی اکرم ﷺ اور سلف صالحین سے ثابت نہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۵۷، ج ۶)

☆ دوسرا نظریہ کہ رمضان میں ایک وتر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سوال ہوا بعض دوستوں کا یہ ذہن ہے کہ ایک وتر با جماعت پڑھنے کا رمضان المبارک کے اندر کوئی ثبوت نہیں۔ تو جواب دیا کہ جب عام حالات میں ایک وتر پڑھنا ثابت ہے با جماعت ہو یا بلا جماعت تو رمضان میں بھی جائز ہے۔ (الاعتصام ص ۱۱، ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۷ء)

(احناف کے نزدیک تین وتر دو تشہد دں اور ایک سلام کے ساتھ ہیں۔ تفصیل کیلئے دیکھیں۔ خزائن السنن ص ۴۱۴، ج ۱)

تراویح پڑھا کر رقم لینا درست ہے یا نہیں؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں

☆ پہلا نظریہ کہ تراویح پڑھانے والا پیسے لے سکتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ایک سوال ہوا حافظ قرآن جو تراویح پڑھاتا ہے اس کو روپیہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب مولانا حافظ محمد گوندلوی صاحب نے دیا اگر کوئی اس کی خدمت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کی ممانعت ثابت نہیں اور آخر میں لکھتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کتاب اللہ پر اجرت لینا اچھا ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۶۰، ج ۶) مولانا علی محمد سعیدی صاحب نے اسی نظریہ کی تائید کی ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۶۱، ج ۶)

☆ دوسرا نظریہ کہ تراویح پڑھانے والا پیسے نہیں لے سکتا۔ چنانچہ سوال ہوا کیا رمضان شریف میں تراویح میں قرآن مجید سنا کر اجرت اور اجرت مقرر کرنے پر قرآن شریف سنانا جائز ہے؟ تو مولانا عبداللہ امرتسری مرحوم جواب لکھتے ہیں۔ اجرت پر قرآن مجید تراویح میں سنانا یا اجرت مقرر کرنا بالکل جائز نہیں بلکہ ایسے شخص کے پیچھے تراویح ہی نہیں ہوتیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۶۱، ج ۶)

(احناف کا مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ اجرت مقرر نہیں کرنی چاہئے لیکن اگر کوئی اپنی مرضی سے کچھ رقم دیتا ہے تو لینے کی گنجائش ہے۔ کفایت المفتی ص ۱۶، ج ۳۔ فتاویٰ رحیمیہ

ص ۴۲۸، ج۴)

زکوۃ اور صدقہ فطر کے مال سے مسجد کی تعمیر

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں

☆ پہلا نظریہ کہ زکوۃ کے مال سے مسجد کی تعمیر درست نہیں چنانچہ ایک سوال ہوا کیا زکوۃ کی رقم مسجد پر صرف کی جاسکتی ہے۔ تو مولانا ابوالبرکات احمد صاحب نے جواب دیا زکوۃ کی رقم مسجد کی عمارت وغیرہ میں صرف نہیں کی جاسکتی۔ اس پر امت کا اجماع و اتفاق ہے۔ اس جواب کی تائید حافظ محمد محدث گوندلوی مرحوم نے بھی کی ہے۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۱۱۲) اور ایک سوال ہوا کہ غریب اہلحدیث جماعت صدقہ فطر کے مال سے مسجد بنانا چاہتے ہیں کیا وہ بنا سکتے ہیں؟ تو جواب دیا گیا مسجد نہیں بنا سکتے یہ غرباء و مساکین کا حق ہے اگر امام مسجد غریب ہے تو لے سکتا ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۳۵۷، ج۱) اور ایک جگہ لکھا ہے کہ اموال زکوۃ کو مساجد میں صرف کرنا ٹھیک نہیں۔ فتاویٰ اہلحدیث ص ۳۲۰، ج۱)

☆ دوسرا نظریہ کہ زکوۃ وغیرہ کی رقم مسجد کی تعمیر پر صرف کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مولانا محمد یونس صاحب دہلوی لکھتے ہیں زکوۃ کا مال فقیروں، مسکینوں، زکوۃ وصول کرنے والوں، نو مسلموں، حاجت مندوں کو دینا چاہئے اور غلاموں کو آزاد کرانے اور مسلمانوں کے جرمانے ادا کرنے اور اللہ کے کاموں میں مسجد مدرسے میں، غریب حاجیوں کے حج کرانے میں اور مسافروں کو دیں۔ (دستور المتقی ص ۱۹۹) اور ایک سوال ہوا کہ مسجد کا کنواں کوئی شخص زکوۃ کی رقم سے بنوا سکتا ہے۔ تو جواب دیا گیا کہ مصارف زکوۃ میں ایک لفظ فی سبیل اللہ ہے اسکی تفسیر جمہور مفسرین خاص ضروریات جہاد کرتے ہیں۔ مگر بعض کے نزدیک اس لفظ کے معنے میں کل نیک کام داخل ہیں اس بناء پر بعض علماء مال زکوۃ کو مسجد وغیرہ مقامات میں بھی صرف کرنا جائز جانتے ہیں۔ خاکسار بھی اس قول کو صحیح جانتا ہے پس صورت مرقومہ میں زکوۃ کے مال سے کنواں بنانا جائز ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۵۱۷، ج۱ اور یہی جواب فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۴۵،

ج۷ میں دیا گیا ہے اور نواب صدیق حسن نے بھی یہی لکھا ہے کہ زکوۃ سے مساجد کی تعمیر درست ہے۔ (بحوالہ فتاویٰ ثنائیہ ص ۷۰۷، ج ۱)

(احناف کے نزدیک زکوۃ وغیرہ صدقات کا مال مسجد میں صرف نہیں کیا جا سکتا یہ فقراء، مساکین کا حق ہے۔ امداد المفتین ص ۳۰۳، ج ۲)

مال تجارت میں زکوۃ

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ مال تجارت مین زکوۃ فرض ہے چنانچہ مال تجارت کی زکوۃ کا عنوان قائم کر کے لکھا گیا ہر قسم کے تجارتی مال میں زکوۃ فرض ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۴۹، ج ۷) اور ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا مال تجارت میں زکوۃ فرض ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۶۴، ج ۷) اور یہی جواب فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۱۷، ج ۱ اور فتاویٰ نذیریہ ص ۹۳، ج ۲ میں دیا گیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ مال تجارت میں زکوۃ فرض نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ نواب وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں لاتجب فی عروض التجارۃ غیر ماورد فیہ النص الزکوۃ عندنا (نزل الابرار ص ۲۰۹، ج ۱) جن اشیاء کی زکوۃ میں نص وارد ہے ان کے علاوہ باقی تجارت کے سامان میں ہمارے نزدیک زکوۃ واجب نہیں ہے۔ اور اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ اموال زکوۃ میں سے سونا، چاندی، گندم، جو، جوار، کھجوریں، زبیب، شہد، گائے، بھیڑ بکریاں اور بھینس ہیں ولا شئی فیما عداھا ولو کانت للتجارۃ و قیل تجب فیھا اذا کانت للتجارۃ (کنز الحقائق ص ۴۳) اور ان کے سوا کسی چیز میں زکوۃ نہیں اگرچہ وہ تجارت کیلئے ہو۔ اور یہ قول بھی ہے کہ جب تجارت کیلئے ہوں تو زکوۃ واجب ہے۔

(احناف کے نزدیک مال تجارت میں زکوۃ فرض ہے جبکہ اس کی شرائط پائی جائیں۔ خیر الفتاویٰ ص ۳۶۱، ج ۳)

عورتیں جو زیور استعمال کرتی ہیں ان میں زکوۃ ہے یا نہیں؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ یہ کہ ان میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔ چنانچہ ایک سوال ہوا کہ جو زیور عورت استعمال کرتی ہے اسمیں زکوۃ ہے یا نہیں؟ تو جواب دیا گیا میری ناقص تحقیق میں زیورات پر زکوۃ واجب نہیں اگر دے تو اچھا ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۹۳، ج۱) اور یہی جواب فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۹۷، ج۱ میں اور فتاویٰ علمائے حدیث ص ۹۵، ج ۷، ص ۹۷، ج ۷، ص ۱۰۰، ج ۷، ص ۳۰۲، ج ۷ میں بھی دیا گیا ہے۔ اور علامہ نواب وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں ولا تجب فی الحلی وقیل تجب فیہ (نزل الابرار ص ۱۹۸، ج۱) زیورات میں زکوۃ واجب نہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ واجب ہے۔ اور وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں ولا تجب فی الحلی (کنز الحقائق ص ۴۵) کہ زیورات میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔

☆ دوسرا نظریہ یہ کہ زیورات میں زکوۃ واجب ہے۔ چنانچہ مولانا ابو سعید شرف الدین دہلوی صاحب اس مسئلہ کی وضاحت کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں خلاصہ یہ کہ زیور مستعملہ میں زکات فرض ہے اس کا خلاف قطعا باطل ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۹۴، ج۱) مزید لکھا ہے کہ حضرت مولانا محمد عبدالرحمن صاحب مبارکپوری شارح ترمذی علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمایا ہے کہ میرے نزدیک ظاہر اور راجح قول یہ ہے کہ سونا اور چاندی کے زیوروں میں زکوۃ واجب ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۹۸، ج۱) اور ایک مقام میں لکھا ہے الحاصل سونے اور چاندی کے زیور میں زکوۃ واجب ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۷۰۱، ج۱) اور ایک مقام میں لکھا ہے ان احادیث سے معلوم ہوا کہ زیورات کی زکوۃ دینی لازم ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۸۹، ج ۷ اور یہی بات ص ۹۸، ج ۷ اور ص ۱۰۷، ج ۷ میں لکھی گئی ہے۔

(احناف کے نزدیک سونے اور چاندی کے زیورات میں زکوۃ واجب ہے۔ خیر الفتاویٰ ص ۳۶۱، ج ۳۔ وخزائن السنن ص ۳۶۶، ج۱)

زکوۃ سے علماء کی خدمت کرنا

زکوۃ کے مال سے علماء ومدرسین کو تنخواہ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ زکوۃ سے علماء ومدرسین کو تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے فقیر کے نزدیک اسی طور سے تنخواہ علماء مدرسین بھی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ اور مزید لکھا ہے کہ یہی موقف نواب صدیق حسن خان کا ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۰۷۔۴۰۸، ج۱)

اورنواب نورالحسن خان صاحب لکھتے ہیں ومنجملہ سبل خدا صرف صدقہ در اہل علم ست کہ قیام دارند بمصالح دینیہ مسلمین (عرف الجادی ص ۶۹) کہ فی سبیل اللہ کے زمرہ میں سے علماء بھی ہیں جو مسلمانوں کے دینی مصالح کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اور ایک مقام میں لکھا ہے منجملہ سبیل اللہ کے علمائے کرام پر صرف کرنا بھی ہے اس لئے ان کا بھی اس مال میں حصہ ہے خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۹۱، ج ۷) مزید لکھا ہے اسی طرح مدرسین کی تنخواہیں اور مناظرین اور مبلغین کا سفر کرایہ اور دیگر ضروری اخراجات جیسے لاؤڈ سپیکر کا کرایہ اور مبلغین کا سفر خرچ اور زائد خدمت زکوۃ سے ہو سکتے ہیں۔ (ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث ص ۷، ۱۹ فروری ۱۹۹۹ء)

☆ دوسرا نظریہ کہ اگر علماء فقیر نہیں تو ان کو زکوۃ نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ مولانا عبدالرحمن صاحب مبارکپوری مرحوم لکھتے ہیں مال زکوۃ سے مدرسین کو تنخواہ دینا یا سامان مدرسہ فراہم کرنا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۰۸، ج۱) اور ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے مال زکوۃ سے مدرسین کو دینا یا سامان مدرسہ فراہم کرنا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۱۳، ج ۷ اور یہی بات ص ۲۲۷، ج ۷ اور فتاویٰ نذیریہ ص ۸۹، ج ۲ میں بھی لکھی ہے۔

(احناف کے نزدیک معلمین کو زکوۃ سے تنخواہ دینا درست نہیں ہے۔ اسی طرح وہ اگر فقیر نہیں تو تب بھی ان کو زکوۃ دینا تنخواہ کے بغیر بھی درست نہیں۔ فتاویٰ دارالعلوم

دیو بند ص ۲۰۹، ج ۲)

لاؤڈ سپیکر پر جنازہ کا اعلان

کیا جنازہ کا اعلان لاؤڈ سپیکر پر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ اعلان جائز ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ نماز جنازہ کیلئے اعلان کرنا جائز ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۴۴۹، ج ۵)

☆ دوسرا نظریہ کہ جنازہ کا اعلان لاؤڈ سپیکر پر کرنا درست نہیں ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے اس صراحت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ موت کی خبر ایک دوسرے کو بتانا تو جائز ہے لیکن منادی بازاروں میں اور سپیکر پر کرنا منع ہے اس سے سائل کا سوال حل ہو گیا ہے کہ مسجد میں جو عام منادی کرتے ہیں کہ فلاں شخص فوت ہو گیا ہے یا فلاں شخص کا جنازہ تیار ہے نماز کیلئے حاضر ہو جاؤ یہ منع ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۴۵۲، ج ۵)

غیر مقلدین کی جانب سے آئے دن بڑے بڑے اشتہارات شائع ہوتے ہیں کہ فلاں شہید کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی جائیگی۔ حالانکہ اس بارہ میں ان کا مسلک تو یہ ہے کہ شہید کی نماز جنازہ نہیں ہے۔ چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی مرحوم لکھتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ شہید کو بغیر غسل اور جنازہ پڑھنے کے دفن کرنا چاہئے۔ (صلوۃ رسول ص ۴۴۱) ایک سوال شہید کی نماز کے بارہ میں ہوا تو جواب دیا گیا راجح مسلک کے مطابق شہید فی المعرکہ کی نماز جنازہ نہیں۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۱۰، یکم ربیع الاول ۱۴۱۹ھ اور جنازہ کے اشتہارات کی صورت پر لکھتے ہیں حالانکہ کسی کی موت پر یہ انداز اعلان اس جاہلیت کی مذموم میں شامل ہے جس کی ممانعت احادیث میں صراحتاً آتی ہے۔ (الاعتصام ص ۸، ۲۴ جولائی ۱۹۹۸ء)

اور ایک مقام میں لکھا ہے اگر یہی کی مذکورہ بالا صورت دیکھی جائے تو ایسے غائبانہ نماز جنازہ کی بھی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے۔ (الاعتصام ص ۱۰، ۱۴ رمضان ۱۴۱۷ھ)

نعی کہتے ہیں کسی کی موت پر اعلانات اور منادی کرنا جیسا کہ اشتہارات کے ذریعہ سے کی جاتی ہے۔
(احناف کے نزدیک جنازہ کا وقت کا اعلان مسجد میں کر سکتے ہیں۔ خیر الفتاویٰ ص ۲۲۴، ج ۳)

نماز جنازہ میں امام اونچی پڑھے یا آہستہ؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ امام اونچی پڑھے۔ چنانچہ مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی لکھتے ہیں۔ امام آواز سے پڑھے اور مقتدی آہستہ (صلوۃ رسول ص ۴۳۳) اور ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے امام آواز سے اور مقتدی آہستہ آہستہ ان دعاؤں کو جو نیچے لکھیں ہیں پڑھیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۰۸، ج ۵)

☆ دوسرا نظریہ کہ امام بھی آہستہ پڑھے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں محدث مبارکپوری نے لکھا ہے انہیں روایات کی وجہ سے جمہور کا یہ مذہب ہے کہ نماز جنازہ میں فاتحہ اور سورہ جہر سے پڑھنا مستحب نہیں ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۰۷، ج ۵) اور یہی بات فتاویٰ نذیریہ ص ۶۶۴، ج ۱ میں بھی لکھی ہے۔
اور ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا ویسے سنت یہی ہے کہ قرأۃ آہستہ پڑھی جائے جیسا کہ نسائی میں ہے۔
۲ بلند آواز سے سورۃ فاتحہ جب تعلیم کیلئے ہو جائز ہے۔ پھر اس کو فتنہ کہنا صحیح نہیں ہاں اس کو عادت بنانا اور سنت سمجھنا صحیح نہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۵۲، ج ۵)
(احناف کے نزدیک اگر کوئی جنازہ میں دعاء کے طور پر فاتحہ پڑھتا ہے تو پڑھ سکتا ہے۔ قرأۃ کے طور پر فاتحہ نہیں پڑھی جا سکتی۔ جنازہ کی دعاؤں کو امام اور مقتدی آہستہ ہی پڑھیں گے۔)

نماز جنازہ میں امام کا دعا کرنا اور مقتدیوں کا آمین کہنا

عام طور پر غیر مقلد ائمہ کرام جنازوں میں دعاء اونچی آواز سے کرتے ہیں

اور مقتدی پیچھے آمین کہتے ہیں حالانکہ یہ طریق خود غیر مقلد علماء کے نزدیک بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا نماز جنازہ کی دعاؤں پر مقتدیوں کے آمین کہنے کا ثبوت جہاں تک راقم کو معلوم ہے آنحضرت ﷺ اور عہد صحابہ وتابعین سے نہیں ملتا۔ بنابریں اس امر کو خلاف سنت کہا جائیگا۔ (فتاوٰی علمائے حدیث ص ۱۹۱، ج ۵)

اور ایک سوال کے جواب میں محدث گوندلویؒ لکھتے ہیں نماز جنازہ میں نمازی اپنی جگہ دعا کرے صرف آمین کا کہیں ذکر نہیں۔ (فتاوٰی علمائے حدیث ص ۱۵۳، ج ۵)

قبرستان میں جوتا پہن کر چلنا

کیا آدمی قبرستان میں جوتے پہن کر چل سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ قبرستان میں جوتا پہن کر چلنا جائز ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے سوال کے جواب میں کہا گیا جوتہ کھڑاؤں پہن کر چلنا جائز ہے۔ (فتاوٰی ثنائیہ ص ۴۹، ج ۲) اور یہی جواب فتاوٰی علمائے حدیث ص ۲۷۹، ج ۵ میں دیا گیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ قبرستان میں جوتا پہن کر چلنا جائز نہیں ہے چنانچہ تشریح کا عنوان قائم کر کے لکھا گیا۔ قبرستان میں جوتی پہن کر چلنا درست نہیں ہے۔ (فتاوٰی علمائے حدیث ص ۲۷۹، ج ۵) اور یہی تشریح والی عبارت فتاوٰی ثنائیہ ص ۴۹، ج ۲ میں بھی لکھی گئی ہے۔

(احناف کے نزدیک اولیٰ یہی ہے کہ قبرستان میں جوتا اتار کر چلے اور جوتا پہن کر چلنے والے سے بھی جھگڑا نہ کیا جائے کیونکہ جواز کے درجہ میں آتا ہے۔ خیرالفتاوٰی ص ۲۲۱، ج ۳)

قبر پر بیٹھنا

کیا کوئی آدمی قبر پر بیٹھ سکتا ہے اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے

ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ بیٹھ سکتا ہے چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا اسی طرح اگر قبر کی تعظیم اور تکریم یا تحقیر مقصود نہ ہو تو پاخانہ پیشاب کے علاوہ نشست و برخاست بھی قبر پر جائز ہو سکتی ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۵۸، ج ۵)

☆ دوسرا نظریہ کہ قبر پر بیٹھنا ممنوع ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا گیا بلاشبہ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ پیشاب اور پاخانہ کیلئے قبر پر بیٹھنا حرام اور ممنوع ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو تو قبر پر بیٹھنا، ٹیک لگانا وغیرہ مختلف فیہ ہے۔ حنابلہ اور ظاہریہ اس کو بھی ناجائز اور ممنوع کہتے ہیں اور یہی مذہب حق اور راجح ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۵۹، ج ۵)

(احناف کے نزدیک قبر پر بیٹھنا مکروہ ہے۔ امداد الفتاویٰ ص ۷۱۵، ج ۱)

میت کی جانب سے فدیہ دینا

اگر کوئی آدمی فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ روزے ہیں تو اس کے وارث کیا کریں؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ میت کے ذمہ جو روزے ہیں ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ چنانچہ اسی قسم کے سوال کے جواب میں لکھا گیا۔ لڑکا اگر بیماری ہی میں مر گیا تو روزے معاف ہیں اگر اچھا ہو کر اس نے روزے نہیں رکھے تو فی روزہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں فدیہ طعام مسکین۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۵۸، ج ۱)

☆ دوسرا نظریہ کہ میت کے روزوں کا فدیہ نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اس کا ولی اس کی جانب سے روزے رکھے۔ چنانچہ مولانا ابو سعید شرف الدین دہلوی صاحب لکھتے ہیں اور اگر قبل صحت مر جائے تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۶۵۸، ج ۱)

اور ایک مقام میں لکھا ہے اس واسطے کہ حدیث متفق علیہ میں آیا ہے کہ جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ

رکھے ۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص۳۴۹، ج۵) اور یہی بات فتاویٰ نذیریہ ص ۴۲۱، ج ۱ میں بھی لکھی ہے۔

(احناف کے نزدیک اگر میت کے روزے وغیرہ رہ گئے ہوں تو ان کا فدیہ دیا جائیگا۔ میت کے ورثا اس کی طرف سے روزے نہیں رکھ سکتے۔ تفصیل کیلئے دیکھیں خزائن السنن ص ۴۷۷، ج۱)

کیا میت کو قرآن کریم کا ثواب پہنچتا ہے؟

غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ میت کو قرآن کریم پڑھنے کا ثواب پہنچتا ہے۔ چنانچہ محدث مبارکپوری صاحب اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں اور مختار یہ ہے کہ پہنچتا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ سے قراءت قرآن کے ثواب پہنچنے کا سوال کرے (یعنی قرآن پڑھ کر دعا کرے اور یہ سوال کرے کہ یا اللہ اس قراءت کا ثواب فلاں میت کو تو پہنچا دے) اور دعا کے قبول ہونے پر امر موقوف رہے گا۔ یعنی اگر دعا اس کی قبول ہوئی تو قراءت کا ثواب میت کو پہنچے گا۔ اور اگر دعا قبول نہ ہوئی تو نہیں پہنچے گا) (فتاویٰ نذیریہ ص ۴۲۷، ج۱) اور یہی عبارت فتاویٰ ثنائیہ ص ۳۹، ج ۲ میں اور فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۶۶، ج ۵ میں بھی لکھی ہے۔

اور ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اجرت لے کر قرآن کریم پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچانا درست نہیں کیونکہ یہ نیک عمل نہیں اور میت کو نیک عمل کا ثواب پہنچتا ہے۔ اور لکھتے ہیں ہاں اگر کسی دوست کی قبر پر انسان ویسے کچھ قرآن پڑھ دے تو یہ جائز ہے اور وصیت اور اجرت پر قرآن پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۴۲۷، ج ۲) اور مولانا شرف الدین صاحب دہلوی مرحوم لکھتے ہیں کہ جمہور اہل سنت کے نزدیک تلاوت قرآن کا ثواب بھی میت کو ملتا ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۳۱، ج ۲) اور ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے قرآن مجید پڑھ کر یا صدقہ خیرات کر کے میت کے لئے استغفار کرنا جائز بلکہ احسن طریقہ ہے۔ رسمی طور پر دن مقرر نہ کرنا

چاہیے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۳۴، ج ۲) اور یہی جواب فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۶۳، ج ۵ میں بھی دیا گیا ہے۔

ایک سوال ہوا کہ میت کو ثواب رسانی کی غرض سے بہ ہیئت اجتماعی قرآن خوانی کرنا درست ہے یا نہیں؟ تو جواب دیا گیا بہ نیت نیک جائز ہے اگرچہ ہیئت کذائی سنت سے ثابت نہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۵۱، ج ۲)

اور مولانا محمد عبداللہ صاحب روپڑی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں امام نوویؒ نے کتاب الاذکار میں لکھا ہے کہ محمد بن احمد مروزیؒ نے کہا ہے میں نے امام احمد بن حنبلؒ سے سنا فرماتے تھے جب تم لوگ قبرستان جاؤ سورۃ فاتحہ، قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس اور قل ھو اللہ احد پڑھو اور اس کا ثواب مردوں کو بخشو مردوں کو ثواب پہنچے گا۔ امام سیوطیؒ نے قراءت قرآن کی روائتیں ذکر کر کے لکھا ہے اگرچہ یہ ضعیف ہیں لیکن ان کا مجموعہ بتاتا ہے کہ ان کی کچھ اصل ہے۔ امام سیوطیؒ نے ان کے مجموعہ پر حسن یا صحیح ہونے کا حکم اس لئے نہیں لگایا کہ ان میں ضعف زیادہ ہے۔ اگر ضعف تھوڑا ہوتا تو مجموعہ مل کر حسن یا صحیح کو پہنچ جاتا۔ خیر ان پر عمل سے روکا نہیں جاتا خاص کر جبکہ امام بھی اس طرف گئے ہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۲۵۸، ج ۵)

اور ایک مقام میں لکھا ہے اور سورۃ یٰسین کا ثواب بھی میت کو پہنچتا ہے۔ (فتاویٰ علماء حدیث ص ۳۴۹، ج ۵ وفتاویٰ نذیریہ ص ۲۱۷، ج ۱) اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم لکھتے ہیں قراءت قرآن سے ایصال ثواب کے متعلق بعد تحقیق یہی فتویٰ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی تلاوت کر کے ثواب میت کو بخشے تو اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ بشرطیکہ پڑھنے والا خود بغرض ثواب بغیر کسی رسم ورواج کی پابندی کے پڑھے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۶۷، ج ۵)

☆ دوسرا نظریہ کہ میت کو قرآن کریم پڑھنے کا ثواب نہیں پہنچتا اور اسی کا آج کل دیہاتی اور گلی کوچوں کی غیر مقلدین کے مساجد کے ائمہ پرچار کرتے ہیں۔

اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب مرحوم ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں قرآن مجید کا ثواب ہدیۃً میت کو دینا اس میں اختلاف ہے بعض لوگ اسے مفید سمجھتے ہیں میری نظر میں اسکی کوئی دلیل نہیں اگر یہ امر مستحسن ہوتا تو آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد بیسیوں قرآن کا ثواب ہدیہ کرتے لیکن سنت میں آنحضرت سے ایک دفعہ قرآن پڑھنا بھی ثابت نہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۴۵، ج ۵)

اور اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ قرآن خوانی کی صورت میں ایصال ثواب کا طریقہ کتاب وسنت سے ثابت نہیں بلکہ میت کیلئے دعا کرنی چاہئے۔ (ہفت روزہ الاعتصام ص ۶، ۱۸ ستمبر ۱۹۹۸ء)

(احناف کے نزدیک صدقہ، قراءت قرآن اور اذکار وغیرہ نیک اعمال کا ثواب میت کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ رسومات کی صورت میں نہ ہو۔ تفصیل کیلئے دیکھیں خزائن السنن ص ۴۷۸، ج ۱)

جس نے اپنا حج نہیں کیا کیا وہ حج بدل کر سکتا ہے؟

غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ جس شخص نے اپنا حج نہیں کیا وہ حج بدل کر سکتا ہے۔ چنانچہ حج بدل پر علمی تبصرہ کا عنوان قائم کر کے اس پر بحث کے آخر میں لکھا ہے اور یقینی طور پر معلوم ہوا کہ حج بدل وہ شخص بھی کر سکتا ہے جس نے پہلے اپنا حج نہ کیا ہو اور غیر مستطیع، غریب، مفلس، تنگدست ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۷۶، ج ۸)

☆ دوسرا نظریہ کہ جس شخص نے ابھی تک اپنا حج نہیں کیا وہ حج بدل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مولانا محمد عبداللہ صاحب روپڑی مرحوم اس مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔ پس ترجیح اسی کو ہے کہ اپنا حج کئے بغیر دوسرے کی طرف سے حج نہیں کر سکتا۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۷۶، ج ۸) اور ایک مقام میں لکھا ہے جب تک کوئی شخص اپنا حج نہ کئے ہو، دوسرے کی طرف سے حج بدل نہیں کر سکتا۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۵۸، ج ۸)

(احناف کے نزدیک افضل یہی ہے کہ حج بدل پر اس کو بھیجا جائے جس نے اپنا حج کیا ہوا ہو۔ خیر الفتاویٰ ص ۲۲۷، ج ۴)

عید کی نماز سے پہلے وعظ و نصیحت

کیا عید کی نماز سے پہلے وعظ و نصیحت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ وعظ و نصیحت کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ایک سوال ہوا کہ عید گاہ میں نماز عید سے قبل کسی قسم کا نماز پڑھنا یا وعظ و نصیحت کرنا یا تبلیغی خدمات کیلئے عید گاہ میں کوئی اجتماعی کاروائی کرنا، چندہ جمع کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ تو جواب دیا گیا۔ عید گاہ میں نماز عید سے قبل یا بعد کوئی نماز نہیں ہے۔ وعظ و نصیحت یا تبلیغی مہم کے سلسلہ میں کوئی مذاکرہ کرنا یا کار خیر کیلئے چندہ جمع کرنا جائز ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۸۱، ج ۴)

☆ دوسرا نظریہ کہ عید کی نماز سے پہلے وعظ وغیرہ درست نہیں ہے۔ چنانچہ ایک سوال ہوا کہ آج کل بعض مولوی نماز عید سے پہلے خطبہ بیان کرتے ہیں کیا نماز عید سے پہلے تلاوت قرآن کوئی وعظ خطبہ اور نعت وغیرہ پڑھنا جائز ہے؟ تو جواب دیا گیا نماز عید سے پہلے خطبہ خلاف سنت ہے۔ اور آگے لکھا ہے نعت یا تلاوت قرآن مجید یا پھر وعظ یہ سب خطبہ میں شامل ہیں۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۹۸، ج ۴)

عید گاہ میں منبر لے جانا کیسا ہے؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ عید گاہ میں منبر لے جانا سنت ہے چنانچہ لکھا ہے۔ اس کے متعلق خیال یہ ہے کہ عید گاہ میں منبر لے جانا مسنون طریقہ ہے اور پھر آگے لکھا ہے یعنی اس حدیث سے عید گاہ میں منبر کا ثبوت ملتا ہے اور رسول اللہ ﷺ اس پر خطبہ دیتے تھے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۹۹، ج ۴)

☆ دوسرا نظریہ کہ عید گاہ میں منبر لے جانا خلاف سنت ہے۔ چنانچہ اس کے بارہ

میں ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا اس حدیث سے کئی مسائل معلوم ہوئے۔ایک یہ کہ نماز خطبہ سے پہلے ہے۔ دوسرا یہ کہ عیدگاہ میں منبر خلاف سنت ہے۔(فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۹۸، ج ۴)

(احناف کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ منبر نہ لے جائیں۔امدادالاحکام ص ۴۶۲، ج ۱)

قربانی کے جانور کی عمر

قربانی کے جانور کے بارہ میں آتا ہے کہ وہ مسنہ ہو اب مسنہ کس کو کہتے ہیں اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ مسنہ کا اعتبار عمر کے لحاظ سے ہے چنانچہ لکھا گیا کہ بھیڑ اور بکری سے مسنہ وہ ہے جو ایک سال کا ہو اور گائے سے وہ ہے جو دو سال کا ہو اور اونٹ سے جو پانچ سال کا ہو اور بھینس گائے کے حکم میں ہے۔(حاشیہ نمبر ۱، فتاویٰ نذیریہ ص ۲۵۸، ج ۳) اور یہی ص ۲۵۷، ج ۳ میں لکھا ہے۔اور ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ بکری ایک برس سے زیادہ کی ہو تو جائز ہے۔دونوں دانت نکلے ہو تو بہتر ہے۔(فتاویٰ ثنائیہ ص ۸۰۹، ج ۱) اور ہفت روزہ میں ایک مضمون قربانی کے مسائل واحکام کے عنوان سے شائع ہوا اس میں لکھا ہے۔قربانی دیتے وقت جانور کی عمر اور اس کے اوصاف کا خیال رکھنا ضروری ہے۔بھیڑ یا دنبہ قربانی کے وقت ایک سال کا ہونا چاہئے۔(تنظیم اہل حدیث ص ۱۱، ۱۷ مارچ ۲۰۰۰ء) اور ایک جگہ لکھا ہے اور ایک سال سے کم عمر کا جانور تو دنبہ کے سوا کسی صورت میں جائز ہی نہیں۔(تنظیم اہل حدیث ص ۶، ۲۱ اپریل ۲۰۰۰ء)

☆ دوسرا نظریہ کہ عمر کا لحاظ نہیں بلکہ جانور کے دو دانت نکلے ہوں تو وہ مسنہ ہے چنانچہ مولانا شرف الدین دہلوی مرحوم لکھتے ہیں۔دو دانت عموماً دو سال میں ہوتے ہیں اس سے کم میں بھی ممکن ہے مگر دو دانت ہونا بکری کیلئے واجب ہے۔(فتاویٰ ثنائیہ ص ۸۰۹، ج ۱) اور مولانا محمد یونس دہلوی لکھتے ہیں جب بکرا یا بکری گائے یا بیل دو برس کا پورا ہو کر تیسرے سال میں لگے یعنی دو دانت ہو چکے تو یہ جانور قربانی کے

میں ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا اس حدیث سے کئی مسائل معلوم ہوئے۔ایک یہ کہ نماز خطبہ سے پہلے ہے۔دوسرا یہ کہ عیدگاہ میں منبر خلاف سنت ہے۔ (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۱۹۸، ج ۴)

(احناف کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ منبر نہ لے جائیں۔امداد الاحکام ص ۴۶۲، ج ۱)

قربانی کے جانور کی عمر

قربانی کے جانور کے بارہ میں آتا ہے کہ وہ مسنہ ہو اب مسنہ کس کو کہتے ہیں اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ مسنہ کا اعتبار عمر کے لحاظ سے ہے چنانچہ لکھا گیا کہ بھیڑ اور بکری سے مسنہ وہ ہے جو ایک سال کا ہو اور گائے سے وہ ہے جو دو سال کا ہو اور اونٹ سے جو پانچ سال کا ہو اور بھینس گائے کے حکم میں ہے۔ (حاشیہ نمبر ۱، فتاویٰ نذیریہ ص ۲۵۸، ج ۳) اور یہی ص ۲۵۷، ج ۳ میں لکھا ہے۔اور ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ بکری ایک برس سے زیادہ کی ہو تو جائز ہے۔دونوں دانت نکلے ہو تو بہتر ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۸۰۹، ج ۱) اور ہفت روزہ میں ایک مضمون قربانی کے مسائل واحکام کے عنوان سے شائع ہوا اس میں لکھا ہے۔قربانی دیتے وقت جانور کی عمر اور اس کے اوصاف کا خیال رکھنا ضروری ہے۔بھیڑ یا دنبہ قربانی کے وقت ایک سال کا ہونا چاہئے۔ (تنظیم اہل حدیث ص ۱۱، ۱۷ مارچ ۲۰۰۰ء) اور ایک جگہ لکھا ہے اور ایک سال سے کم عمر کا جانور تو دنبہ کے سوا کسی صورت میں جائز ہی نہیں۔ (تنظیم اہل حدیث ص ۶، ۲۱ اپریل ۲۰۰۰ء)

☆ دوسرا نظریہ کہ عمر کا لحاظ نہیں بلکہ جانور کے دو دانت نکلے ہوں تو وہ مسنہ ہے چنانچہ مولانا شرف الدین دہلوی مرحوم لکھتے ہیں۔دو دانت عموماً دو سال میں ہوتے ہیں اس سے کم میں بھی ممکن ہے مگر دو دانت ہونا بکری کیلئے واجب ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۸۰۹، ج ۱) اور مولانا محمد یونس دہلوی لکھتے ہیں جب بکرا یا بکری گائے یا بیل دو برس کا پورا ہو کر تیسرے سال میں لگے یعنی دو دانت ہو چکے تو یہ جانور قربانی کے

قابل ہوتا ہے۔اور اس جانور کو مسنہ کہتے ہیں۔ (دستور المتقی ص ۱۸۱)

(احناف کے نزدیک قربانی کا جانور بھیڑ بکری ایک سال سے اور گائے دو سال سے اور اونٹ پانچ سال سے زائد کا ہو تو ثنی ہوتا ہے۔امداد الفتاویٰ ص ۶۱۳، ج ۳)

جذعہ کتنی عمر کا جانور ہوتا ہے؟

حدیث میں آتا ہے کہ اگر مسنہ نہ ملے تو ضأن یعنی بھیڑ میں سے موٹے تازے جذعہ کی قربانی بھی ہو سکتی ہے۔یہ جذعہ کتنی عمر کا ہوتا ہے؟ اس میں غیر مقلدین کے کئی نظریات ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ جذعہ چھ ماہ کا ہوتا ہے۔چنانچہ جامعہ تعلیم الاسلام ناموں کانجن سے جو اشتہار شائع ہوتا ہے اس میں ہے کہ جذعہ چھ ماہ کا ہوتا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ جذعہ آٹھ ماہ کا ہوتا ہے چنانچہ غیر مقلد عالم محمد عبداللہ شجاع آبادی نے جو پمفلٹ لکھا اس میں ہے کہ جذعہ آٹھ ماہ کا ہوتا ہے۔

☆ تیسرا نظریہ کی جذعہ نو ماہ کا ہوتا ہے چنانچہ دار الحدیث اوکاڑہ کا اشتہار شائع ہوا۔اس میں ہے کہ جذعہ نو ماہ کا ہوتا ہے۔

☆ چوتھا نظریہ کہ جذعہ سال کا ہوتا ہے۔چنانچہ مولانا محمد یونس دہلوی لکھتے ہیں مینڈھا اور بھیڑ جب پورے ایک سال کے ہو جائیں تو وہ قابل قربانی ہو جاتے ہیں اور اس عمر کے بھیڑ مینڈھے جذع کہلائے جاتے ہیں۔(دستور المتقی ص ۱۸۱)

اسی صورت حال سے پریشان ہو کر مولانا عبدالرحمٰن عزیز صاحب خطیب مرکزی جامع مسجد اہل حدیث حسین خانوالہ پتوکی نے لکھا۔مقام حیرت وتعجب ہے کہ محققین، مدرسین پیدا کرنے والے ادارے جذعہ کی عمر کا تعین نہیں کر سکے۔(تنظیم اہل حدیث ص ۹، ۳ مارچ ۲۰۰۰ء)

(احناف کے نزدیک بھیڑ یا دنبہ میں سے جذعہ اس کو کہتے ہیں جس کی عمر چھ ماہ مکمل ہو چکی ہو۔ہدایہ ص ۴۳۳، ج ۴)

بھینس کی قربانی

غیر مقلدین کے اس بارہ میں دو نظریے ہیں

☆ پہلا نظریہ کہ بھینس کی قربانی جائز ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ بھینس گائے کے حکم میں ہے۔ (حاشیہ نمبرا، فتاویٰ نذیریہ ص ۲۵۸، ج ۳)

ایک سوال ہوا کہ بھینس کی حلت کی قرآن وحدیث سے کیا دلیل ہے۔ اور اس کی قربانی بھی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ تو جواب دیا گیا جہاں حرام چیزوں کی فہرست دی ہے وہاں یہ الفاظ مرقوم ہیں قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ او دما مسفوحا۔ ان چیزوں کے سوا جس چیز کی حرمت ثابت نہ ہو وہ حلال ہے۔ بھینس ان میں نہیں۔ اس کے علاوہ عرب لوگ بھینس کو بقرہ گائے میں داخل سمجھتے ہیں۔ اور آگے تشریح کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے حجاز میں بھینس کا وجود ہی نہ تھا پس اس کی قربانی نہ سنت رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہے نہ تعامل صحابہؓ سے۔ ہاں اگر اس کو جنس بقر سے مانا جائے جیسا کہ حنفیہ کا قیاس ہے (کمافی الھدایۃ) یا عموم بھیمۃ الانعام پر نظر ڈالی جائے تو حکم جواز قربانی کیلئے یہ علت کافی ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۸۱۰، ج ۱)

اور ایک سوال ہوا کہ کیا قربانی کے حکم میں بھینس یا بھینسا بھی گائے کی جنس کے حکم میں آسکتا ہے؟ تو مولانا ابوالبرکات احمد صاحب نے جواب دیا کہ بھینس بھینسا دونوں بقر کی نوع میں سے ہیں۔ لہذا اس کا حکم بھی گائے کی طرح ہے۔ فتاویٰ برکاتیہ ص ۳۴۲۔ اس فتویٰ پر محدث گوندلوی مرحوم کے دستخط بھی ہیں۔

☆ دوسرا نظریہ کہ بھینس کی قربانی جائز نہیں۔ چنانچہ لکھا ہے بھیمۃ الانعام کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ دنبہ، بکری۔ اونٹ۔ گائے۔ بھینس ان چار میں نہیں اور قربانی کے متعلق حکم ہے۔ بھیمۃ الانعام سے ہو اس بنا پر بھینس کی قربانی جائز نہیں۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۴۲۶، ج ۲) اسی طرح ہفت روزہ الاعتصام ص ۳۰۔ ۱۹ جون ۱۹۹۸ء میں لکھا ہے کہ بھینس کی قربانی جائز نہیں۔

(احناف کے نزدیک بھینس گائے کی قسم سے ہے۔ ہدایہ ص ۴۳۳۔ ج ۴)

ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول جانا

ایک سوال ہوا کہ اگر ذبح کے وقت بسم اللہ بھول جائے تو وہ جانور حلال ہے یا حرام؟ تو جواب دیا گیا مسلم بسم اللہ بھول جائے تو معاف ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۸۹، ج ۲) مولانا شرف الدین صاحب اس جواب سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں حرام ہے اسلئے کہ یہ نص صریح کتاب اللہ کے خلاف ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں۔ پس کتاب اللہ اور حدیث سے بسم اللہ واللہ اکبر ذبیحہ کیلئے شرط ہے۔ فـاذا فـات الشرط فات المشروط. (فتاویٰ ثنائیہ ص ۹۰، ج ۲)

(احناف کے نزدیک اگر بسم اللہ ذبح کے وقت بھول جائے تو ذبیحہ حلال ہے۔ امداد الفتاویٰ ص ۵۵۸، ج ۳)

ایک مجلس کی تین طلاقیں

عام طور پر غیر مقلدین یہی کہتے اور لکھتے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہوتی ہے اور یہ محدثین کا نظریہ ہے جیسا کہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ محدثین کے نزدیک ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقیں ایک رجعی کا حکم رکھتی ہیں (فتاویٰ ثنائیہ ص ۲۱۵، ج ۲) لیکن مولانا شرف الدین صاحب دہلوی اس کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں یہ مسلک صحابہؓ تابعین، تبع تابعین وغیرہ ائمہ محدثین متقدمین کا نہیں ہے۔ یہ مسلک سات سو سال کے بعد کے محدثین کا ہے جو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فتوی کے پابند اور ان کے معتقد ہیں یہ فتوی شیخ الاسلام نے ساتویں صدی ہجری کے اخیر یا اوئل آٹھویں میں دیا تھا تو اس وقت کے علمائے اسلام نے ان کی سخت مخالفت کی تھی نواب صدیق حسن مرحوم نے اتحاف النبلاء میں جہاں شیخ الاسلام کے متفردات مسائل لکھے ہیں اس فہرست میں طلاق ثلاثہ کا مسئلہ بھی لکھا ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۲۱۹، ج ۲)

غیر مقلدین خواہ مخواہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کا نظریہ محدثین کا بتاتے ہیں حالانکہ یہ تو امام ابن تیمیہؒ کے تفردات میں سے ہے۔ تفرد کا مطلب یہ ہے کہ کسی عالم کی ذاتی تحقیق اور بڑے بڑے علماء کے تفردات موجود

ہیں۔ ان تفردات میں ان علماء کو معذور سمجھا جاتا ہے ان پر کسی قسم کا فتویٰ نہیں لگایا جاتا۔ مگر ان تفردات کی پیروی نہیں کی جاسکتی۔

علیحدہ علیحدہ مجالس میں تین طلاقیں

اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کو علیحدہ علیحدہ مجالس میں تین طلاقیں دیتا ہے اور درمیان میں رجوع نہیں کرتا تو اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ متفرق مجالس کی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں خواہ درمیان میں رجوع ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا جب تین طلاقین متفرق ہوں تو عورت بالاتفاق حرام ہو جاتی ہے۔ خواہ تھوڑی مدت کے بعد دے یا کئی سالوں میں دے۔ اور خواہ درمیان میں رجوع کیا ہو یا نہ۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۵۸، ج ۳)

اور ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے لیکن متعدد مجالس کی دو یا تین طلاقیں متعدد ہی شمار ہونی چاہییں۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۶۵، ج ۳) اور ایک سوال ہوا کہ شوہر نے خفا ہو کر لکھا کہ اپنی بہن کو نہ لاؤ گے تو میں طلاق دے دوں گا تب بھی نہیں لائے بعدہ طلاق دینا شروع کیا دو مہینے میں دو طلاق دیں پھر ایک مہینے کے بعد تیسرے مہینے میں تیسری طلاق دی اور بی بی کو گھر سے نکال دیا ایسی طلاق دینے سے بی بی حرام ہوئی ہے یا نہیں؟ تو جواب دیا گیا کہ یہ طلاق صحیح مغلظہ ہے اس سے بیوی قطعی حرام ہوگئی۔ ایسے کہ پہلے خاوند کو ہرگز جائز نہیں تاوقتیکہ اور خاوند سے نکاح کرے اور وہ بخوشی طلاق دے پھر عدت بھی گذر جائے۔ (فتاوی ثنائیہ ص ۲۹۸، ج ۲)

اور ایک سوال ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر مختلف محافل میں تین طلاقیں دیں تو اس کا کیا حکم ہے تو جواب دیا گیا کہ مذکورہ بالا صورت میں دوبارہ نہیں ہو سکتا۔ (الاعتصام ص ۶، ۲۶ جون ۱۹۹۸ء) اور ایک مقام میں لکھا کہ مجلس سے مراد یہ ہے کہ اس بارہ میں بحث و مباحثہ کیلئے جو مجلس ہوئی ہے۔ جب تک وہ برخاست نہ ہو

بعد میں وقفہ وقفہ سے طلاق دینے سے متعدد مجالس ہو جائیں گی اور یہ طلاقیں مؤثر ہوں گی۔(ہفت روزہ الاعتصام ص ۹، ۹ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ) اور ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے۔ ہر مہینے ایک طلاق دی تو تین طلاقوں کے بعد شوہر دوبارہ عقد نہیں کر سکتا۔(الاعتصام ص ۹، ۲۴ نومبر ۱۹۹۵ء)

☆ دوسرا نظریہ کہ پہلی طلاق کے بعد اگر رجوع نہیں کیا تو دوسری طلاق واقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ مولانا ابوالبرکات احمد صاحب ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں جب تک اس طلاق سے رجوع نہ ہو تو دوبارہ طلاق کا قطعاً جواز نہیں اگر بلا رجوع دوبارہ طلاق دی جائے تو وہ پہلی طلاق کی تاکید ہوگی شرعاً وہ مستقل طلاق نہیں۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۲۳۴) اور ایک مقام میں لکھا ہے بغیر رجوع کے تین حیض میں تین طلاقیں دینے کو ایک ہی شمار کیا جائے۔ فتاویٰ برکاتیہ ص ۲۴۰۔ ان جوابات کی تصدیق محدث گوندلوی مرحوم نے کی ہے۔

اور ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے بہر صورت طلاق ایک واقع ہوگی کیونکہ عین حکم اللہ و رسول کا یہی ہے کہ طلقات متعددہ وقت واحد بلکہ طہر واحد میں حکم میں ایک طلاق میں ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۸۱، ج ۳) آج کل بعض غیر مقلدین علماء بڑے زور و شور سے اسی نظریہ کا پرچار کر رہے ہیں۔

(احناف کے نزدیک مدخول بہا عورت کو ایک ہی کلمہ سے اکٹھی تین طلاقیں دی جائیں یا ایک ہی مجلس میں تین دفعہ طلاق دی جائے تو یہ طلاق بدعی ہے۔ مگر تینوں واقع ہو جاتی ہیں۔ ہدایہ ص ۳۵۵، ج ۲۔ اور اگر عورت غیر مدخول بہا ہو تو اگر ایک کلمہ سے اس کو تین طلاق دے گا تو تینوں واقع ہو جاتی ہیں اور اگر متفرق طور پر دے گا تو وہ ایک طلاق سے بائنہ ہو جاتی ہے۔ فتاویٰ دارالعلوم ص ۳۷۳، ج ۹)

ایک ایک مہینے میں تین طلاقوں کے بعد عدت کتنی ہے

اگر آدمی نے اپنی بیوی کو ہر مہینے ایک طلاق دی تیسرے مہینے تیسری طلاق کے بعد اس عورت کی عدت کتنی ہوگی؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے

ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ ایسی صورت میں عورت پر صرف ایک حیض عدت ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ جس عورت کو تین طہر میں تین طلاقیں ہوئی ہوں اس پر آخری طلاق کے بعد صرف ایک حیض عدت ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۹۳، ج ۳)

☆ دوسرا نظریہ کہ ایسی صورت میں عدت تین حیض ہے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے ہر طہر میں طلاق حدیث کے خلاف ہے اور آگے لکھا ہے یعنی ظاہر یہی ہے کہ تیسری طلاق کے بعد تین حیض عدت گذارے اور جو پہلے حیض آتے رہے وہ پہلی طلاقوں کی عدت میں شامل ہیں۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۹۷، ج ۳) اسی طرح ایک مقام میں لکھا ہے ایک ایک ماہ بعد تین طلاقیں ہوئی ہوں تو تیسری طلاق کے تین حیض عدت گذارے۔ (الاعتصام ص ۱۰، ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء)

(احناف کے نزدیک ایسی حالت میں تیسری طلاق کے بعد ہی عدت شروع ہوتی ہے۔)

جبری طلاق

اگر کوئی آدمی کسی پر زبردستی کر کے اس سے طلاق دلواتا ہے تو طلاق ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ طلاق نہیں ہوتی چنانچہ اسی قسم کے سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ جبریہ طلاق جائز نہیں لا اکراہ فی الدین لیکن جبر کا ثبوت ہونا چاہئے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۳۰۰، ج ۲)

☆ دوسرا نظریہ کہ جبری طلاق ہو جاتی ہے چنانچہ مولانا شرف الدین دہلوی مرحوم لکھتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ اکراہ میں اختیار باقی رہتا ہے اور فعل مکرہ یا قول کا اعتبار ہے۔ پس طلاق واقع ہو جائے گی۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۳۰۰، ج ۲)

(احناف کے نزدیک اگر کسی نے جبر کیا اور آدمی نے زبان سے طلاق دیدی تو یہ جبری

طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ شامی ص ۴۵۷، ج ۲)

وٹہ سٹہ کا نکاح

نکاح شغار جس کو وٹہ سٹہ کا نکاح کہا جاتا ہے اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ اگر ایک آدمی نے اپنی بیٹی یا بہن کا نکاح کسی سے کیا اور اس سے اس کی رشتہ دار عورت کا نکاح اپنے لئے کرایا تو اگر دونوں کے مہر علیحدہ علیحدہ مقرر کئے گئے ہوں تو یہ وٹہ سٹہ کا نکاح جائز ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں مولانا ابو البرکات احمد صاحب لکھتے ہیں۔ جس کی تصدیق محدث گوندلوی مرحوم نے کی ہے وہ لکھتے ہیں نکاح شغار شرعاً ممنوع ہے۔ اسکی تشریح حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ ایک شخص اپنی لڑکی یا بہن کو نکاح میں اس شرط پر دیتا ہے کہ دوسرا اپنی بہن یا بیٹی کو پہلے کے نکاح میں دے اور دونوں کے درمیان مہر نہ ہو۔ اور پھر آگے لکھتے ہیں لہذا اوٹے کا نکاح اس صورت میں جائز ہے کہ نکاح میں اس کی شرط نہ لگائیں۔ نیز مہر مقرر ہو ورنہ نہیں۔ (فتاویٰ برکاتیہ ص ۲۱۲) اور ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ جب دونوں عورتوں کا اول مہر علیحدہ علیحدہ باندھا جاوے پھر عقد کیا جاوے تو یہ عقد درست ہے اور شغار ممنوع میں داخل نہیں ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۱۶۸، ج ۳)

☆ دوسرا نظریہ کہ بیشک دونوں عورتوں کا علیحدہ علیحدہ مہر باندھا گیا ہو تب بھی حرام ہے۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا درمیان میں مہر ہو یا نہ ہو وٹہ سٹہ کا نکاح حرام ہے۔ (الاعتصام ص ۶، ۱۳۰ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اور غیر مقلد عالم مولوی ابوالسلام محمد صدیق صاحب اپنی کتاب راہ سنت میں لکھتے ہیں اس نکاح میں مہر کا ذکر ہو یا ذکر نہ ہو ہر دو حالت میں یہ نکاح فاسد اور باطل ہے۔

(احناف کے نزدیک اگر دونوں طرف سے مہر علیحدہ علیحدہ مقرر ہو تو یہ نکاح جائز ہے۔ اسی طرح اگر مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تب بھی جائز ہے اور دونوں کو مہر مثل ملے گا ہدایہ

ص ۳۲۷، ج ۲۔اور اگر بالکل دونوں جانب سے مہر کی نفی کر دی گئی ہو اور دونوں آدمی مہر نہ دینے پر مصر ہوں تو یہ نکاح شغار ہے اور ممنوع ہے)

کیا ثیبہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر سکتی ہے؟

ثیبہ اس عورت کو کہا جاتا ہے جو پہلے کسی خاوند کے نکاح میں رہ چکی ہو خواہ اس کا خاوند فوت ہو گیا ہو یا پہلے خاوند نے طلاق دے دی ہو۔ کیا ایسی عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ جس طرح کنواری کیلئے ولی کی اجازت غیر مقلدین کے ہاں ضروری ہے اسی طرح وہ ثیبہ کیلئے بھی ولی کی اجازت ضروری قرار دیتے ہیں اور اس کے بغیر نکاح کو درست نہیں مانتے۔ اور اکثر اسی نظریہ کو مانتے اور اس کا پرچار کرتے ہیں۔

☆ دوسرا نظریہ کہ ثیبہ کیلئے ولی کی اجازت شرط نہیں اس کے بغیر بھی اس کا نکاح ہو جاتا ہے، چنانچہ غیر مقلد عالم محمد عبدالعظیم حیدر آبادی اس مسئلہ میں باقی حضرات سے اختلاف کرتے ہوئے بحث کے دوران لکھتے ہیں کہ دو احادیث کی تطبیق سے نتیجہ صاف نکلتا ہے کہ باکرہ اپنی کم سنی اور اپنے ماں باپ کے لاڈ پیار اور عدم تجربہ کے لحاظ سے گو اس کی بھی اجازت چاہئے جو محض سکوت پر مبنی ہے مگر ولی کی شرط ضرور ہے۔ جس میں لا نکاح الا بولی و البکر تستأذن فرمان نبوی کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اور ثیبہ بوجہ اس کے کہ وہ پہلے خاوند کے سرد و گرم طبیعت سے واقف ہے اور اپنی ذات کیلئے خوب انتخاب کر سکتی ہے جو الثیب احق بنفسھا من ولیھا کو شامل ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۲۸۱، ج ۲)

(احناف کے نزدیک بالغہ عورت خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ اس پر ولی جبر نہیں کر سکتا اور ولی کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح ہو جاتا ہے۔ مگر بہتر نہیں ہے)

کیا بڑی عمر والے کیلئے کسی عورت کا دودھ پینا حلال ہے؟

غیر مقلدین حضرات کے اس بارہ میں دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ دودھ پینا حلال ہے چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا جو حدیث سوال میں نقل کی گئی ہے اس سے شیر زن کی حلت بالغ کے حق میں ثابت ہوتی ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۳۱۲، ج ۲) اور ایک سوال ہوا کہ کیا عورت کا دودھ پینا مطلقاً حرام ہے سوائے رضیع کے؟ تو جواب دیا گیا کہ حرام نہیں کہہ سکتے، حرمت کی کوئی دلیل نہیں ملی۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۸۶، ج ۳)

☆ دوسرا نظریہ کہ مدت رضاعت کے بعد دودھ پینا حرام ہے۔ چنانچہ مولانا شرف الدین دہلوی صاحب مرحوم لکھتے ہیں بہر حال اب واقعہ سھلہ پر عمل نہیں اور شیر زن مرد کبیر کو جائز نہیں حرام ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۳۱۳، ج ۲) (شیر زن کا مطلب ہے عورت کا دودھ)

(احناف کے نزدیک بڑی عمر میں کسی عورت کا دودھ پینا جائز نہیں حرام ہے۔ فتاویٰ رحیمیہ ص ۲۲۴، ج ۳)

حاملہ بالزنا سے نکاح

ایک آدمی نے کسی عورت سے زنا کیا اور اس عورت کو اس سے حمل ٹھہر گیا تو اس حمل کی حالت میں یہی زنا کرنے والا اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ نکاح کر سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا شرف الدین دہلوی اس مسئلہ کہ حاملہ بالزنا سے نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ خود زانی سے نکاح ہو۔ دوسری یہ کہ غیر زانی سے۔ صورت ثانیہ میں علت منع ان یسقی ماءہ زرع غیرہ پائی جاتی ہے۔ اولیٰ میں نہیں۔ پس صورت اولیٰ میں جواز ہو سکتا ہے۔ ثانیہ میں نہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۱۷۴، ج ۲) ایک سوال ہوا کہ عورت حمل زنا والی کا عقد اس شخص کے ساتھ جس کا حمل ہے درست ہے یا نہیں تو جواب دیا گیا کہ شخص مذکور کا نکاح عورت مذکورہ کے ساتھ جائز ہے۔

(فتاویٰ ثنائیہ ص ۶ ۷ ۱، ج ۲)

☆ دوسرا نظریہ کہ اس حالت میں نکاح نہیں ہوسکتا چنانچہ مولانا عبداللہ امرتسری مرحوم ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زنا سے حاملہ کا نکاح صحیح نہیں اور چونکہ شریعت میں زانی کا حمل نہ زانی کا وارث ہوتا ہے نہ زانی کے ساتھ اس کی نسبت ملتی ہے۔ اسلئے وہ زانی سے بیگانہ ہوا تو اگر زانی نکاح پڑھنا چاہے اس کا نکاح بھی صحیح نہیں۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۱۹۹، ج ۳) اور ایک جگہ نکاح زانیہ کا عنوان قائم کر کے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ فدوی کی ناقص تحقیق میں قبل وضع حمل نکاح صحیح نہیں خواہ حمل اسی ناکح کا ہو یا غیر کا۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۷ ۷ ۱، ج ۲)

(احناف کے نزدیک حاملہ من الزنا سے نکاح درست ہے۔ اگر حمل اسی نکاح کرنیوالے کا ہو تو اس کو نکاح کے بعد وطی کرنا جائز ہے۔ اور اگر حمل کسی دوسرے کا ہو تو نکاح کرنے والا وضع حمل تک وطی نہیں کرسکتا۔ فتاویٰ دار العلوم ص ۲۰۴، ج ۷)

دباغت سے پہلے مردار کا چمڑا بیچنا

چمڑے کو دھوپ میں ڈال دیتے ہیں یا نمک یا کوئی مسالہ وغیرہ لگاتے ہیں جسکی وجہ سے اس کے ریشے خشک ہو جاتے ہیں اور پھر بدبو نہیں آتی اس کو دباغت کہتے ہیں۔ اگر مردار جانور کا چمڑا ہو اور اسکو دباغت نہ دی گئی ہو تو کیا اس کا بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ مردار کا چمڑا دباغت دیئے بغیر بیچنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ ایک سوال ہوا مردار کا چمڑا گیلا خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ تو جواب دیا کہ مردار کے چمڑے کی خرید وفروخت دباغت (رنگنے سے پہلے) جائز ہے بعض سلف سے ایسا ہی منقول ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانا میرے ناقص علم میں جائز نہیں ہے۔ فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۳۲، ج ۲ اور فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۰۱، ج ۲ میں لکھا ہے کہ میں بھی اس کو جائز سمجھتا ہوں۔ اور یہی جواب فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۵، ج ۱ میں دیا گیا ہے۔

☆ دوسرا نظریہ کہ دباغت سے پہلے مردار کے چمڑے کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ایک سوال ہوا کہ مردار کا چمڑہ بلا مدبوغ خرید و فروخت کرنا اور منفعت و قیمت کھانے و پینے میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو جواب دیا گیا کہ جائز نہیں ہے جواز کیلئے دباغت شرط ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۱۲۸، ج ۲) اور یہی بات فتاویٰ ثنائیہ ص ۱۰۴، ج ۲ میں لکھی گئی ہے۔ اسی طرح آگے لکھا ہے بغیر دباغت کے مردہ مویشی کے چمڑے کی خرید و فرحت جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۱۲۹، ج ۲)

(احناف کے نزدیک دباغت سے پہلے مردار جانور کے چمڑے کی خرید و فروخت اور اس کا استعمال درست نہیں ہے۔ ہدایہ ص ۳۹، ج ۳)

کیکڑا حلال ہے یا حرام؟

کیکڑا جس کو عربی میں سرطان کہا جاتا ہے۔ کیا یہ کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ کیکڑا حلال ہے چنانچہ ایک سوال ہوا کہ سرطان یعنی کیکڑا حلال ہے یا حرام؟ تو جواب دیا کہ سرطان کی حرمت مجھے کسی آیت یا حدیث میں نہیں ملی۔ اس لئے بحکم ذرونی ماترکتکم حلال ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۱۰۹، ج ۲)

☆ دوسرا نظریہ کہ کیکڑا حرام ہے۔ چنانچہ لکھا ہے یعنی بوجہ خبیث اور مضر ہونے کے سرطان کا کھانا حرام ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۱۱۰، ج ۲)

(احناف کے نزدیک پانی کے جانوروں میں صرف مچھلی حلال ہے۔ اسلئے کیکڑا اور کچھوا کھانا درست نہیں ہے۔ فتاویٰ محمودیہ ص ۳۸۲، ج ۱۱)

حرام سے تیار کردہ دوائی کا حکم

جس دوائی میں حرام کی ملاوٹ ہو کیا اس کا استعمال درست ہے یا نہیں؟ اس کے بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ ایسی دوائی کا استعمال درست نہیں۔ چنانچہ مسئلہ بیان کیا گیا کہ

انگریزی ادویات کا استعمال جن میں شراب کی آمیزش ہوتی ہے منع ہے کیونکہ شراب پاخانہ پیشاب کی طرح نجاست غلیظہ ہے اس کی حرمت کی وجہ نشہ نہیں ہے۔ کیونکہ سو قطرہ دوائی میں اگر ایک قطرہ شراب ہوگا تو وہ نشہ نہیں لائے گا۔ کیونکہ اتنی دوائی میں شراب کا ایک قطرہ تو فنا ہو جائے گا۔ اس کی حرمت باعتبار نجاست کے ہے کیونکہ اس کا ایک قطرہ تمام دوائی کو اسی طرح پلید کر دے گا جیسے پانی کے ایک مٹکے کو پیشاب کا ایک قطرہ۔ شراب ملی دواؤں کا یہی حکم ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۴۱۴، ج ۳) اور دوسرے مقام میں لکھا ہے حرام اور ناپاک چیز سے جیسے شراب وغیرہ سے دوا کرنا حرام و ناجائز ہے خواہ وہ حرام اور ناپاک چیز اپنی حالت پر باقی رہے یا دواؤں میں ملا کر اس کی حالت بدل دی گئی ہو۔ (فتاویٰ نذیریہ ۴۱۵، ج ۳)

☆ دوسرا نظریہ کہ اگر نشہ باقی نہ رہے تو اس دوائی کا استعمال جائز ہے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب سے کشتہ مارنا جائز نہیں خواہ کشتہ تیار ہونے کے بعد نشہ رہے یا نہ۔ رہی یہ بات کہ کوئی اس جرم کا ارتکاب کرے اور کشتہ تیار ہونے کے بعد نشہ کا نام و نشان نہ رہے تو اس صورت میں یہ کشتہ استعمال کرنا جائز ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۳۱۵، ج ۳) اور یہی فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۴۰، ج ۱ میں لکھا گیا ہے۔

شراب سے سرکہ بنانا اور اس کا استعمال

اگر کسی نے شراب میں کوئی چیز ڈال کر اس کا سرکہ بنالیا تو کیا اس کا استعمال درست ہے یا نہیں؟ اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں۔

☆ پہلا نظریہ کہ اس سرکہ کا کھانا جائز نہیں ہے، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ تاڑی و شراب کا سرکہ بنانا حرام ہے اور تاڑی و شراب کا سرکہ بنایا ہوا کھانا بھی حرام و ناجائز ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۲۱۸، ج ۲) اور ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ جب حدیث میں شراب کا سرکہ بنانا منع ہو چکا ہے تو اس کا استعمال کس طرح حلال ہو سکتا ہے۔ (فتاویٰ اہلحدیث ص ۳۱۶، ج ۳)

☆ دوسرا نظریہ کہ شراب سے تیار کردہ سرکہ استعمال کرنا جائز ہے چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ مگر چونکہ حدیث میں شراب کے سرکہ بنانے سے صراحۃ نہی آئی ہے۔اس لئے پرہیز چاہئے۔ہاں اگر کسی نے جرم کا ارتکاب کر کے دواء تیار کرلی ہو یا سرکہ بنالیا ہو تو اس کے استعمال کی کچھ گنجائش ہے۔مگر پھر بھی پرہیز اچھا ہے کیونکہ اس میں اختلاف ہے۔(فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۳۹، ج ۱) اور علامہ وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں والخمر اذا استحال خلا یحل اکله (نزل الابرار ص ۵۰، ج ۱) کہ شراب جب سرکہ میں تبدیل ہو جائے تو اس کا کھانا حلال ہے۔

(احناف کے نزدیک شراب کا سرکہ بن جائے یا بنایا جائے تو اس کا استعمال درست ہے۔ہدایہ ص ۴۸۳، ج ۴)

سگریٹ اور حقہ پینا کیسا ہے؟

اس بارہ میں غیر مقلدین کے دو نظریئے ہیں

☆ پہلا نظریہ کہ تمباکو پینا حرام ہے۔چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا اس سے معلوم ہوا کہ جو پرہیز گار نہ ہو وہ امامت کا اہل نہیں۔حقہ بالکل حرام ہے۔جو اس سے پرہیز نہ کرے وہ امامت کا کب اہل ہو سکتا ہے۔(فتاویٰ اہلحدیث ص ۲۲۷، ج ۲)

اور ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا کہ حقہ اور سگریٹ پینا مختلف وجوہ کی بنا پر حرام ہے۔(الاعتصام ص ۹، ۱۳ محرم ۱۴۱۵ھ) اور ایک مقام پر لکھا ہے تمباکو کی کاشت کاروبار اور پینا حرام ہے۔(الاعتصام ص ۱۲، ۱۴ نومبر ۱۹۹۷ء) اور ایک جگہ لکھا ہے حقہ پینے والے کو امام مقرر نہیں کرنا چاہئے کیونکہ حقہ حرام ہے۔(الاعتصام ص ۱۱، ۷ ارمضان ۱۴۱۸ھ) اور ایک جگہ لکھا ہے سگریٹ اور تمباکو فی نفسہ حرام ہیں۔(الاعتصام ص ۷، ۲۳ ا اکتوبر ۱۹۹۸ء) اور ایک جگہ لکھا ہے پس حقہ سگریٹ وغیرہ کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔(فتاوی اہلحدیث ص ۳۲۰، ج ۳)

دوسرا نظریہ کہ سگریٹ حقہ پینا حرام نہیں ہے۔چنانچہ ایک سوال کے جواب

میں لکھا گیا جو لوگ حقہ نوشی کی حرمت کے قائل ہیں ان کا قول نا قابل اعتماد ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۳۲۳، ج ۳) اور آگے لکھا ہے اور جب ثابت ہوا کہ تمبا کو حرام نہیں تو پانی حقہ کا کیونکر ناپاک اور پلید ہوگا۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۳۲۴، ج ۳)

ایک مقام میں لکھا ہے جو لوگ حقہ نوشی کی حرمت کے قائل ہیں ان کا قول نا قابل اعتماد ہے۔ اور آگے لکھا ہے اور جو لوگ اباحت مع الکراہۃ کے قائل ہیں ان کا قول البتہ قابل اعتماد ہے۔ یہ گفتگو حقہ نوشی میں ہے رہا تمبا کو کا کھانا اور استعمال کرنا اس کا ناک میں سو کوئی دلیل معتبر اس کی کراہت پر قائم نہیں اور تمبا کو ایک پاک چیز ہے اور اس کا دھواں بھی پاک ہے پس اس کے پانی کے ناپاک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۷۹۔ ۸۰، ج ۲) اور ایک جگہ لکھا ہے جو لوگ حقہ نوشی کی حرمت کے قائل ہیں ان کا قول نا قابل اعتماد ہے (فتاویٰ علمائے حدیث ص ۳۰، ج ۱) (احناف کے نزدیک حقہ اور سگریٹ پینا مکروہ ہے۔ بشرطیکہ نشہ والا نہ ہو۔ نشہ والا ہو تو حرام ہے۔ فتاویٰ محمودیہ ص ۸۷۔ ۱۲۲، ج ۵)

آخر میں گذارش

قارئین کرام سے گذارش ہے کہ آپ نے اس رسالہ میں ایک ایک مسئلہ میں دو دو تین تین متضاد نظریات جو پڑھے ہیں۔ وہ حنفی، شافعی وغیرہ مختلف مسالک کے پیروکاروں اور مختلف ائمہ کے مقلدین کے نہیں اور نہ ہی دیوبندی اور بریلوی کی طرح مختلف مکاتب فکر کے ہیں۔ بلکہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ پر عمل پیرا ہونے کے دعویداروں اور فقہ کو اختلاف کا سبب کہنے والوں کے مسلمہ علماء کے ہیں اور یہ ہم نے صرف بطور نمونہ چند ایسے مسائل ذکر کئے ہیں جو نماز و روزہ جیسی اہم عبادات سے متعلق اور ہر وقت اور ہر جگہ پائے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اس سے کئی گنا ایسے مسائل ان حضرات کی کتابوں میں ایسے ملتے ہیں جن میں ان کا آپس میں اختلاف نمایاں ہے۔ ہمارا مقصد ان حضرات کے باہمی اختلافات کو اجاگر کرنا نہیں بلکہ فقہ اسلامی کے خلاف جو منظم پروپیگنڈہ اور سازش کی جارہی ہے اور فقہ کو اختلافات کا

